# تدبّرِ قرآن

۳۶

## یٰسٓ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

## ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سورۂ یٰسٓ اور گروپ کی پچھلی دونوں سورتوں کے عمود میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ پچھلی سورتوں میں توحید، معاد اور رسالت کے جو مطالب زیرِ بحث آئے ہیں انہی پر اس میں بھی بحث ہوئی ہے۔ البتہ تفصیل و اجمال اور نہجِ استدلال کے اعتبار سے فرق ہے۔ پچھلی سورہ کے بعض مطالب اس میں تاریخی اور فطری دلائل سے اچھی طرح محکم و مدلل کر دیے گئے ہیں۔ اس کا آغاز اثباتِ رسالت کے اسی مضمون سے ہوا ہے جس پر سابق سورہ تمام ہوئی ہے۔ اور فلسفۂ دین کے نقطۂ نظر سے غور کیجیے تو یہ حقیقت بھی واضح طور پر نظر آئے گی کہ اس کی بنیاد بھی، پچھلی سورتوں کی طرح، شکر اور اس کے مقتضیات ہی پر ہے۔ آگے ہم سورہ کے مطالب کا تجزیہ پیش کرتے ہیں جس سے اس کا عمود اور نظام ان شاء اللہ اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔

## ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۱۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اثبات اور آپ کو تسلی کہ یہ پُرحکمت قرآن خود اس بات کی سب سے بڑی شہادت ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ یہ قرآن، خدائے عزیز و رحیم کی طرف سے، ان لوگوں پر ایک عظیم احسان ہے جو اب تک خدا کی تعلیم و ہدایت سے بالکل محروم ضلالت میں بھٹک رہے تھے۔ یہ محض ان کی بدقسمتی ہے کہ استکبار کے سبب سے یہ اس کو جھٹلا رہے ہیں۔ ان کی پچھلی روایات اور ان کی مستقبل کی آرزوئیں ان کے لیے حجاب بنی ہوئی ہیں اس وجہ سے نہ یہ ماضی سے کوئی سبق لے رہے ہیں اور نہ مستقبل کا کچھ دھیان کر رہے ہیں۔ آپ ایسے بے فکروں کے لیے زیادہ پریشان نہ ہوں۔ جو خدا سے ڈریں اور نصیحت کو سنیں ان کو مغفرت اور اجرِ عظیم کی بشارت دیجیے۔ جو نہیں سنتے ان کا معاملہ ہمارے حوالے کیجیے۔ ان کا اگلا پچھلا سب ہمارے رجسٹر میں درج ہے۔ ہم ان سے نمٹ لیں گے۔

(۱۳-۳۲) قریش کی عبرت کے لیے ایک بستی کی تمثال جس کے باشندوں کے انذار کے لیے اللہ تعالیٰ نے دو

رسول بھیجے جب انھوں نے ان کی نہیں سنی تو اللہ نے ایک تیسرے بندے کو ان رسولوں کی تائید کے لیے اٹھایا۔ لیکن انھوں نے اس کی بھی کوئی پروا نہیں کی۔ ان کی تنبیہ کے لیے اس دوران میں جو نشانیاں ظاہر ہوئیں لوگوں نے ان کو ان رسولوں کی نحوست قرار دیا اور اس جرم میں ان کو سنگسار کر دینے کی دھمکی دی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے اپنے عذاب سے اس بستی کو ہلاک کر دیا۔

(۳۳-۴۴) اس کائنات میں خدا کی قدرت، حکمت، پروردگاری اور رحمت کی جو نشانیاں ہیں ان میں سے بعض کی طرف اشارہ اور اس امر کا بیان کہ یہ ساری نشانیاں اللہ تعالیٰ کے شکر کو واجب کرتی ہیں جس کا لازمی تقاضا توحید ہے اور ساتھ ہی یہ حشر و نشر اور جزاء و سزا کو مستلزم ہیں۔

(۴۵-۵۰) اس امر کا بیان کہ جب لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا جاتا ہے اور اس سے بچنے کے لیے اللہ کی راہ میں انفاق کی دعوت دی جاتی ہے تو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جن کو خدا نے اپنے فضل سے محروم رکھا ہم اپنا مال ان پر کیوں خرچ کریں! انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ خدا کو جب عذاب لانا ہوگا تو اس کے لیے اسے کوئی تیاری نہیں کرنی پڑے گی بلکہ وہ چشم زدن میں آجائے گا جس کے بعد کسی کو لب ہلانے کی فرصت نصیب نہیں ہوگی۔

(۵۱-۶۵) قیامت کی تصویر اور اس دن ایمان لانے والوں اور اس کے جھٹلانے والوں کا جو حال ہوگا اس کی تفصیل۔

(۶۶-۶۸) عذاب کا مطالبہ کرنے والوں کو یہ تنبیہ کہ سمع و بصر کی جو صلاحیتیں خدا نے بخشی ہیں ان سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنی عقل سے کام لو۔ اگر ان صلاحیتوں سے فائدہ نہ اٹھایا تو خدا ان کو مسخ بھی کر سکتا ہے اور یہ کام خدا کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔

(۶۹-۸۳) خاتمۂ سورہ جس میں ابتدائے سورہ کے مضمون کو ایک نئے اسلوب سے لیا ہے۔ توحید اور قیامت کی بعض نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ تمہارا کام زندوں کو جگانا ہے۔ جو لوگ اخلاقی اعتبار سے مردہ ہو چکے ہیں ان پر تمہارا کلام کارگر نہیں ہو سکتا۔

# سُوْرَةُ یٰسٓ (۳۶)

مَکِّیَّۃٌ — اٰیَاتُھَا ۸۳

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آیات ۱-۱۲

یٰسٓ ﴿۱﴾ وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ ﴿۲﴾ اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۳﴾ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۴﴾ تَنْزِیْلَ الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ ﴿۵﴾ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُھُمْ فَھُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۶﴾ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓی اَکْثَرِھِمْ فَھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۷﴾ اِنَّا جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِھِمْ اَغْلٰلًا فَھِیَ اِلَی الْاَذْقَانِ فَھُمْ مُّقْمَحُوْنَ ﴿۸﴾ وَجَعَلْنَا مِنْ بَیْنِ اَیْدِیْھِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِھِمْ سَدًّا فَاَغْشَیْنٰھُمْ فَھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ ﴿۹﴾ وَسَوَآءٌ عَلَیْھِمْ ءَاَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰﴾ اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّکْرَ وَخَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ فَبَشِّرْہُ بِمَغْفِرَۃٍ وَّاَجْرٍ کَرِیْمٍ ﴿۱۱﴾ اِنَّا نَحْنُ نُحْیِ الْمَوْتٰی وَنَکْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَھُمْ وَکُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰہُ فِیْٓ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ ﴿۱۲﴾

وقف غفران — ع ۱۲ — ۱۸

ترجمہ آیات ۱-۱۲

یہ سورۂ یٰسٓ ہے۔ شاہد ہے پُر حکمت قرآن کہ تم رسولوں میں سے ہو۔ ایک نہایت سیدھی راہ پر۔ جس کو نہایت اہتمام سے اتارا ہے خدائے عزیز و رحیم نے کہ تم ان لوگوں کو آگاہ

کردو جن کے اگلوں کو آگاہ نہیں کیا گیا پس وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بہتوں پر ہماری بات پوری ہو چکی ہے تو وہ ایمان لانے والے نہیں بنیں گے۔ ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے ہیں جو ان کی ٹھوڑیوں تک ہیں پس ان کے سر اٹھے رہ گئے اور ہم نے ان کے آگے سے بھی ایک روک کھڑی کر دی ہے اور ان کے پیچھے سے بھی ایک روک کھڑی کر دی ہے۔ اس طرح ہم نے ان کو ڈھانک دیا ہے پس ان کو سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ اور ان کے لیے یکساں ہے، ان کو ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، وہ ایمان نہیں لانے کے۔ تم تو بس انہی کو ڈرا سکتے ہو جو نصیحت پر دھیان کریں اور غیب میں خدائے رحمان سے ڈریں۔ سو ایسے لوگوں کو مغفرت اور باعزت صلہ کی بشارت دو۔ بے شک ہم مُردوں کو زندہ کریں گے اور ہم نوٹ کر رہے ہیں جو کچھ انھوں نے آگے کے لیے بڑھایا اور جو کچھ پیچھے چھوڑا اور ہم نے ہر چیز ایک واضح کتاب میں محفوظ کر لی ہے۔ ۱-۱۲

## ۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰسٓ (۱)

یہ حروف مقطعات میں سے ہے جن پر ایک جامع بحث سورۂ بقرہ کی تفسیر کے شروع میں گزر چکی ہے۔ یہ اس سورہ کا قرآنی نام ہے۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی 'یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ' کے لیے ہیں لیکن یہ بات بالکل بے دلیل ہے۔

وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ ۝ اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ (۲-۳)

قرآن کے اعجاز میں اصل دخل اس کی حکمت کو ہے

'و' قسم کے مفہوم میں ہے اور قسم عربی میں، جیسا کہ ہمارے استاذ مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب 'الامعان فی اقسام القرآن' میں وضاحت فرمائی ہے، شہادت کے لیے آتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ پر حکمت قرآن جو تم لوگوں کو سنا رہے ہو، خود اس بات کی شہادت کے لیے کافی ہے کہ تم رسولوں کے زمرے سے تعلق رکھنے والے ہو۔ رسول کے سوا کوئی دوسرا اس طرح کا حکیمانہ اور معجز کلام پیش کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے اعجاز میں اصل دخل اس کی حکمت؛ اس کے فلسفہ کو ہے۔ اس کی زبان کی بلاغت و جزالت

مزید برآں ہے۔

عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۴)

قرآن سے اعراض فطرت سے انحراف کا نتیجہ ہے

یہ خبر کے بعد دوسری خبر ہے اور اس کا بغیر حرف عطف کے آنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ قرآن حکیم بیک وقت دونوں باتوں کا شاہد ہے۔ اس بات کا بھی کہ تم اللہ کے رسولوں میں سے ہو اور اس بات کا بھی کہ تم بالکل سیدھی راہ پر ہو اور لوگوں کو سیدھی راہ پر چلنے کی دعوت دے رہے ہو۔ تنکیر یہاں تفخیم شان کے لیے ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ راہ عقل و فطرت اور خدا کی بتائی ہوئی نہایت سیدھی راہ ہے۔ جو لوگ یہ سیدھی راہ اختیار کرنے سے گریز کر رہے ہیں انھوں نے اپنی فطرت بگاڑ لی ہے اور اپنی عقل سے کام لینا چھوڑ دیا ہے اس وجہ سے انھیں سیدھی چیز ٹیڑھی نظر آ رہی ہے۔

تَنْزِیْلَ الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ (۵)

قرآن انذار اور بشارت ہے

'تَنْزِیْلَ' فعل محذوف سے منصوب ہے۔ اس کے معنی کی وضاحت دوسرے مقام میں ہم کر چکے ہیں کہ یہ کسی چیز کو درجہ بدرجہ نہایت اہتمام کے ساتھ اتارنے کے لیے بھی آتا ہے۔ یہ قرآن کے ایک دوسرے پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس کو خدائے عزیز و رحیم نے نہایت اہتمام و تدریج کے ساتھ اتارا ہے کہ لوگ اس پر غور کریں، اس کو سمجھیں اور اس سے 'صراط مستقیم' کی رہنمائی حاصل کریں۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی دو صفتوں کا حوالہ ہے۔ ایک 'عزیز' دوسری 'رحیم'۔ ان میں ایک صفت انذار کے لیے ہے اور دوسری بشارت کے لیے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس کی تکذیب کریں گے وہ یاد رکھیں کہ یہ کسی سائل کی درخواست نہیں بلکہ ایک عزیز و مقتدر کا فرمان واجب الاذعان ہے جو سرکشی کرنے والوں کو لازماً سزا دے گا۔ ساتھ ہی وہ رحیم بھی ہے اور اپنی اس رحمت ہی کے لیے اس نے یہ کتاب اتاری ہے۔ تو جو اللہ کے بندے اس قرآن کی قدر کریں گے ان کو وہ اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے گا۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ (۶)

بنی اسماعیل کو تنبیہ

یہ قرآن کے اتارنے کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ نے اس کو اس اہتمام سے اس لیے اتارا ہے کہ جن کے اندر تم سے پہلے کسی رسول کی بعثت نہیں ہوئی تھی اور وہ غفلت میں پڑے ہوئے تھے، ان کو تم زندگی کے انجام سے اچھی طرح آگاہ کر دو۔ یہ اشارہ بنی اسماعیل کی طرف ہے اور یہ اس عظیم احسان کا بیان ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور حضرات انبیاء علیہم السلام کی پیشین گوئیوں کے مطابق اللہ تعالیٰ نے امیوں پر کیا۔ اس میں ان کے لیے ترغیب کے ساتھ یہ ترہیب بھی ہے کہ اگر انھوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو اپنے لیے سب سے بڑی سعادت کی جگہ سب سے بڑی شقاوت کا سامان کریں گے۔ یہی مضمون دوسرے مقامات میں اس طرح بیان ہوا ہے۔ 'لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِیْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ' (القصص: ۴۶) (تاکہ تم ان لوگوں کو آگاہ کر دو جن کے پاس تم سے پہلے کوئی نذیر نہیں آیا)۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓی اَکْثَرِھِمْ فَھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (۷)

سرکشوں سے اعراض کی ہدایت

'قول' سے اشارہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرف ہے جو اس نے ابلیس کے جواب میں اس وقت فرمایا تھا جب اس نے یہ دھمکی دی تھی کہ میں ذریت آدم کی اکثریت کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لَاَمْلَئَنَّ جَھَنَّمَ مِنَ الْجِنَّۃِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ (میں ایسے تمام جنوں اور انسانوں سے جو تیری پیروی کریں گے دوزخ کو بھر دوں گا) اسی قول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تمہارا فرض انذار کرنا ہے وہ کرتے رہو لیکن یہ توقع نہ رکھو کہ ان میں سے ہر شخص تمہاری دعوت قبول کرے گا بلکہ ان میں بہتیرے ایسے ہیں جن پر ہماری بات صادق آچکی کہ وہ ابلیس کی پیروی کے جرم میں جہنم کے ایندھن بنیں گے۔ اس طرح کے لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ ان کے درپے اور ان کے لیے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

اِنَّا جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِھِمْ اَغْلٰلًا فَھِیَ اِلَی الْاَذْقَانِ فَھُمْ مُّقْمَحُوْنَ (۸)

متکبرین کے استکبار کی تصویر

یہ ان ایمان نہ لانے والوں کے استکبار کی تصویر ہے کہ گویا ان کی گردنوں میں ایسے طوق پڑے ہوئے ہیں جو ان کی ٹھوڑیوں تک پہنچتے ہیں جس کے سبب سے ان کے سر اس طرح اٹھے ہوئے رہ گئے ہیں کہ نہ وہ نیچے کی طرف جھک سکتے ہیں اور نہ اوپر ہی کی طرف اٹھ سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ وہ زمین کی نشانیاں دیکھ سکتے اور نہ آسمان کے عجائب ہی پر نگاہ ڈال سکتے۔ ان کی اس حالت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے کہ ہم نے ان کو ایسا بنا دیا ہے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم جگہ جگہ اشارہ کرتے آرہے ہیں، یہ ہے کہ کسی فرد یا گروہ کی یہ حالت اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق ہوتی ہے۔ جو لوگ حق سے انحراف و اعراض کی یہ روش دیدہ و دانستہ اختیار کر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے آنکھیں بند کر کے زندگی گزارتے ہیں ان کے اوپر اللہ ان کی خواہشیں اور ان کے اعمال اسی طرح مسلط کر دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر کوئی تعلیم و تذکیر ان پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ اسی حقیقت کی طرف کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (المطففین: ۱۴) میں اشارہ فرمایا ہے۔

'مقمح' اصل میں اس اونٹ کو کہتے ہیں جس کا سر پیچھے کی جانب اس طرح باندھ دیا گیا ہو کہ اس کی گردن ایک خاص حد سے نہ نیچے ہو سکے نہ اوپر۔ بالکل یہی حال اس شخص کا ہوتا ہے جس کے گلے میں آہنی طوق ڈال دیا جائے، وہ بھی اپنا سر نہ نیچے کر سکتا ہے نہ اوپر بلکہ ایک خاص زاویہ پر اس کی گردن تنی رہتی ہے۔ یہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، متکبرین کی تصویر ہے۔ اس طرح کے لوگ اپنے اوپر نیچے اور دہنے بائیں کی تمام نشانیوں سے بے خبر ہی رہتے ہیں۔ ان کو اپنی 'انا' کے سوا اور کسی چیز کی طرف کبھی توجہ نہیں ہوتی۔

وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْھِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِھِمْ سَدًّا فَاَغْشَیْنٰھُمْ فَھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ (۹)

یہ اوپر والے مضمون ہی کی وضاحت ہے کہ اس طرح ہم نے ان کے آگے اور پیچھے دونوں طرف سے اوٹ کھڑی کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے جس کے سبب سے انھیں کچھ سجھائی نہیں

دے رہا ہے۔ ان کی اسی حالت پر سورۂ سبا میں اظہارِ تعجب فرمایا ہے: اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (۹) (کیا ان لوگوں نے ان کے آگے اور پیچھے جو آسمان و زمین ہیں ان پر نگاہ نہیں ڈالی؟) اس طرح کے متکبرین کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ یہ اپنی پچھلی روایات اور اپنے مستقبل کے مطامع کے غلام ہوتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں ان کی راہ میں اس طرح روک بن جاتی ہیں کہ ان سے ہٹ کر وہ کوئی چیز دیکھنے کے قابل رہ ہی نہیں جاتے۔

وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۰)

ظاہر ہے کہ اس طرح کے لوگ ایک سخت قسم کی عقلی و اخلاقی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کو ڈرانا یا نہ ڈرانا اصل مقصد کے لحاظ سے بالکل بے سود ہوتا ہے۔ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں بنتے۔ ان کو اگر انذار کیا جاتا ہے تو محض اتمامِ حجت کے لیے کہ قیامت کے دن یہ کوئی عذر نہ پیش کر سکیں۔ سورۂ بقرہ کے شروع میں ختمِ قلوب پر جو بحث گزر چکی ہے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ (۱۱)

قرآن ان پر کارگر ہو سکتا ہے جو عقل سے کام لیں

یعنی تمہاری تعلیم و تذکیر تو بس انہی کے اوپر کارگر ہو سکتی ہے جو تمہاری نصیحت سنیں، اس پر غور کریں اور اپنے دلوں کے دروازے اس کے لیے کھولیں نیز یہ کہ وہ اپنی عقل سے کام لیں، نرے محسوسات کے غلام بن کے زندگی نہ گزاریں کہ جب تک ان کو عذاب نہ دکھا دیا جائے اس وقت تک کوئی بات ماننے ہی کے لیے تیار نہ ہوں۔ ایمان معتبر وہ ہے جو سمع و بصر اور عقل و دل کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا کر لایا جاتا ہے نہ کہ حقائق کو آنکھوں سے دیکھ کر۔ فرمایا کہ جو لوگ سب کچھ آنکھوں سے دیکھ کر ایمان لانا چاہتے ہیں ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔ البتہ ان لوگوں کو مغفرت اور اجرِ کریم کی بشارت دو جو غیب میں رہتے خدائے رحمان سے ڈرتے ہیں۔

خدا کی خشیت اس کی رحمانیت کا تقاضا ہے

یہ حقیقت ہم جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں کہ خدا سے خشیت درحقیقت اس کی رحمانیت کا تقاضا ہے۔ وہ رحمان ہے اس وجہ سے لازم ہے کہ وہ نیکوں کو ان کی نیکی کا صلہ اور بدوں کو ان کی بدی کی سزا دے۔ اسی رحمانیت کے ظہور کے لیے اس نے جزا اور سزا کا دن مقرر کیا ہے جس میں اس کی کامل رحمت اور اس کے کامل عدل کا ظہور ہو گا۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ۭ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ (۱۲)

روزِ جزا کی یاد دہانی

یہ اسی روزِ جزا کی یاد دہانی ہے جو اس کی رحمانیت کا لازمی تقاضا ہے۔ فرمایا کہ ایک دن آئے گا کہ ہم تمام مُردوں کو زندہ کریں گے اور اس دنیا میں انھوں نے آگے کے لیے جو کچھ کیا اور پیچھے کے لیے جو کچھ چھوڑا ہے ہم اس سارے کو قلم بند کر رہے ہیں۔ مقصود اس سے اس کے لازم کو واضح کرنا ہے کہ جب ہم سب کو

زندہ بھی کریں گے اور ہر ایک کے اعمال نوٹ بھی کر رہے ہیں تو لازماً ہر ایک کے ساتھ اس کے اعمال کے مطابق معاملہ بھی کریں گے۔ اس لازمی نتیجہ کی یہاں وضاحت نہیں کی۔ اس کی وجہ اول تو یہ ہے کہ یہ بغیر ذکر کے بھی واضح ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ قیامت کے باب میں منکرین کا اصلی شبہ صرف دو پہلوؤں سے تھا۔ ایک اس پہلو سے کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کو مستبعد سمجھتے تھے۔ دوسرا اس پہلو سے کہ اتنی وسیع دنیا کے تمام اعمال و اقوال کون محفوظ رکھ سکتا ہے کہ وہ ایک دن اس سارے کا حساب کرنے بیٹھے؟ یہ دونوں شبہات یہاں صاف کر دیے جن کے بعد اس کا لازمی نتیجہ خود بخود سامنے آ گیا۔

'مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ' میں وہی مضمون بیان ہوا ہے جو دوسرے مقام میں 'یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ اس دنیا میں انسان بہت سے کام اپنے تصور کے مطابق، آخرت کے لیے کرتا ہے اور بہت سے کام اپنی اس دنیا کی زندگی یا اپنے بعد والوں کے لیے کرتا ہے۔ فرمایا کہ ہم اس کے ان دونوں ہی طرح کے کاموں کو نوٹ کر رہے ہیں۔

'امام مبین' سے مراد — 'وَکُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْٓ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ'۔ 'اِمَام' کے اصلی معنی رہنما، ہادی، لیڈر اور مرجع کے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ اس کتاب کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو سب کے لیے رہنما اور مرکز و مرجع کی حیثیت رکھتی ہو۔ چنانچہ ہود آیت ۱۷ اور احقاف آیت ۱۲ میں یہ لفظ تورات کے لیے آیا ہے۔ یہاں یہ اس مرکزی کتاب کے لیے استعمال ہوا ہے جس میں ہر شخص کے اعمال درج ہوں گے اور جس کے مطابق ہر شخص جزا یا سزا پائے گا۔ یہ اوپر والے ٹکڑے کی مزید وضاحت ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ لوگوں کے اعمال و اقوال کی تحریر میں ہم نے کسی غفلت و بے پروائی سے کام لیا ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ ہر چیز ایک نہایت واضح دفتر میں ہم نے درج کر رکھی ہے جو سب کے سامنے اس کا سارا کچا چٹھا پیش کر دے گا۔

## ۲۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۱۳-۳۲

ایک بستی کی مثال — آگے قریش کے سامنے رسولوں کی تکذیب کا انجام واضح کرنے کے لیے ایک بستی کی مثال پیش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بستی والوں کے انذار کے لیے اپنے دو رسول بھیجے لیکن انھوں نے ان کی تکذیب کر دی۔ اس کے بعد اللہ نے اپنے ایک تیسرے مُنذر سے اپنے رسولوں کو کمک پہنچائی لیکن بستی والوں نے اس کی بھی کوئی پروا نہ کی۔ ان کی تنبیہ کے لیے جو نشانیاں ظاہر ہوئیں ان کو انھوں نے رسولوں کی نحوست پر محمول کیا اور ان کو سنگسار کر دینے کی دھمکی دی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک فیصلہ کن عذاب بھیج کر ان کو بالکل پامال کر دیا۔

اس بستی سے کس بستی کی طرف اشارہ ہے؟

قرآن نے اس بستی کا نام نہیں لیا ہے اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سے کون سی بستی مراد ہے؟ مفسرین نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس سے مراد انطاکیہ ہے اور یہاں جن رسولوں کا ذکر ہے وہ اللہ کے رسول نہیں بلکہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بھیجے ہوئے سفیر تھے جن کو حضرتؑ نے اپنے شاگردوں میں سے انتخاب کر کے انطاکیہ والوں کے انذار کے لیے بھیجا تھا۔ میرے سامنے بروقت جو تفسیریں ہیں ان سب میں یہی روایت نقل ہوئی ہے۔ ابن کثیرؒ نے اس پر متعدد شبہات وارد کر کے اگرچہ اس کو مجروح کر دیا ہے لیکن اس کے سوا کوئی اور قول چونکہ ان کو نہیں ملا اس وجہ سے انھوں نے بھی اختیار اسی کو کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ قول متعدد وجوہ سے بے بنیاد ہے۔

۱- اس کے بے بنیاد ہونے کی پہلی وجہ یہ ہے کہ یہاں ان رسولوں کا جس طرح ذکر ہوا ہے اور انھوں نے اپنے آپ کو جس حیثیت سے لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے اس سے صاف واضح ہے کہ یہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بھیجے ہوئے رسول نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسول تھے اور اسی حیثیت سے انھوں نے اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ مثلاً فرمایا ہے اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَیْہِمُ اثْنَیْنِ فَکَذَّبُوْھُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَیْکُمْ مُّرْسَلُوْنَ (یاد کرو جب کہ ہم نے ان کی طرف دو رسول بھیجے تو انھوں نے ان کو جھٹلا دیا تو ہم نے ایک تیسرے سے ان کو قوت پہنچائی تو انھوں نے لوگوں کے سامنے اعلان کیا کہ ہم تمھاری طرف رسول ہو کر آئے ہیں) آگے اسی سلسلہ میں یہ بھی آتا ہے کہ جب لوگوں نے اس بنا پر ان کو جھٹلایا کہ وہ انھی کی طرح بشر ہیں تو انھوں نے تیدِ قسم کے ساتھ کہا کہ رَبُّنَا یَعْلَمُ اِنَّآ اِلَیْکُمْ لَمُرْسَلُوْنَ (ہمارا رب گواہ ہے کہ ہم تمھاری طرف رسول ہو کر آئے ہیں)۔ اگر یہ لوگ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بھیجے ہوئے سفیر تھے تو ان کے بھیجے کو اللہ تعالیٰ نے اس صراحت و تاکید کے ساتھ اپنی طرف کیوں منسوب فرمایا؟ اور اگر انھوں نے اپنے آپ کو اللہ کے رسول کے بجائے حضرت عیسٰیؑ کے سفیر کی حیثیت سے لوگوں کو دعوت دی ہوتی تو لوگ ان کی بشریت کی بنا پر ان کی تکذیب کیوں کرتے؟ رسولوں کے مکذبین نے ان کی بشریت کو تکذیب کا بہانہ تو اس بنیاد پر بنایا کہ وہ خدا کے رسول ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ اس پر لوگ یہ اعتراض اٹھاتے تھے کہ اگر خدا کوئی رسول بھیجتا ہوتا تو کیا وہ ہمارے ہی جیسے انسانوں کو رسول بناتا، آخر اس نے اپنے فرشتوں یا کسی اور برتر مخلوق کو اس منصب کے لیے کیوں نہیں انتخاب کیا؟

۲- دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے زمانے میں پیش آیا اور اس کا نتیجہ اہلِ انطاکیہ کی تباہی کی شکل میں ظاہر ہوا تو یہ اتنا بڑا واقعہ تھا کہ انجیلوں اور بائیبل ہسٹری میں اس کا ذکر ضرور ہوتا لیکن نہ تو انجیلوں میں اس کا کوئی ذکر ہے اور نہ تاریخوں ہی میں اس کی طرف کوئی اشارہ ہے بلکہ تاریخوں میں اس کے برعکس یہ اشارہ ملتا ہے کہ اہلِ انطاکیہ نے حضرت عیسٰی علیہ السلام پر ایمان

لانے میں سبقت کی۔

۳- تیسری وجہ یہ ہے کہ یہاں اس واقعہ کا ذکر قریش کے سامنے ایک معروف واقعہ کی حیثیت سے ہوا ہے۔ چنانچہ یہاں قریہ پر الف لام عہد کا داخل ہے۔ 'اصحاب قریۃ' نہیں کہا ہے بلکہ 'اصحاب القریۃ' فرمایا ہے۔ اور موقع و محل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ یہاں کسی معروف واقعہ کا ذکر کیا جائے اس لیے کہ اس سے مقصود قریش کو انذار و تخویف ہے اور یہ مقصد صرف ایک مشہور واقعہ ہی سے حاصل ہو سکتا تھا نہ کہ ایک ایسے واقعہ سے جس سے وہ بالکل بے خبر ہوں۔

۴- چوتھی وجہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی اسرائیل کے رسول تھے اس وجہ سے غیر قوموں کو نہ تو انھوں نے خود دعوت دی اور نہ ان کی طرف اپنے شاگردوں ہی کو بھیجا بلکہ انھوں نے غیر قوموں کے پاس جانے سے اپنے شاگردوں کو روکا۔ ان کا ارشاد ہے کہ 'میں صرف اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں ہی کی تلاش کے لیے آیا ہوں'۔ غیر قوموں کے بارے میں ان کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ 'میرے پاس جو روٹی ہے وہ صرف بچوں ہی کے لیے ہے، کتوں کے آگے اس کو ڈالنا ٹھیک نہیں ہے'۔ اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انطاکیہ میں انھوں نے اپنے شاگردوں کو کن کے پاس بھیجا؟ غیر قوموں کے پاس تو ظاہر ہے کہ وہ بھیج نہیں سکتے تھے۔ رہے بنی اسرائیل تو بشریت کی بنیاد پر تو انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کی بھی تکذیب نہیں کی تو اس بنیاد پر وہ ان کے شاگردوں کی تکذیب کیوں کرتے؟ وہ جن نبیوں کے معتقد تھے ان کو وہ بشر مانتے تھے اس وجہ سے وہ یہ اعتراض نہیں اٹھا سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے خلاف ہر قسم کے فتنے اٹھائے لیکن یہ اعتراض نہیں اٹھایا کہ آپ بشر ہیں بلکہ قریش نے جب یہ اعتراض اٹھایا تو قرآن نے بنی اسرائیل ہی کو گواہ کی حیثیت سے پیش کیا کہ ان سے پوچھ لو کہ ہم نے جتنے نبی یا رسول بھیجے سب بشر ہی تھے۔

۵- پانچویں وجہ یہ ہے کہ آگے مذکور ہے کہ ان رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں ان کے اوپر ایسا فیصلہ کن عذاب آیا کہ وہ بالکل پامال ہو کے رہ گئے: 'إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ خَامِدُونَ (۲۹)' (بس ہماری ایک ڈانٹ ہی تھی کہ وہ چشمِ زدن میں پامال ہو کے رہ گئے)۔ اس قسم کے فیصلہ کن عذاب سے متعلق ہم سنتِ الٰہی کی وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ صرف رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں، کامل اتمامِ حجت کے بعد ہی، آیا ہے۔ یہود کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کے نتیجہ میں ان پر اس طرح کا کوئی عذاب نہیں آیا جس طرح کا عذاب سابق رسولوں کے مکذبین پر آیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس جرم میں ان پر قیامت تک کے لیے لعنت کر دی۔ لعنت کا عذاب تمام عذابوں سے زیادہ سخت ہے جس کے سبب سے وہ دنیا میں بھی ہمیشہ ذلیل و پامال رہیں گے اور آخرت میں بھی ان کے لیے ذلت و رسوائی ہے۔ اس کی وضاحت سورۂ اعراف اور سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر میں ہم کر

چکے ہیں۔

اس قول کے ضعف کے یہ وجوہ بالکل واضح ہیں۔ ان کے علاوہ بعض اور وجوہ بھی ہیں جو آگے آیات کی تفسیر کے ذیل میں سامنے آئیں گے۔ ہمارے نزدیک اس قریہ سے اشارہ مصر کی طرف ہے جہاں حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام اور تیسرے مردِ حق کی تکذیب کے نتیجہ میں فرعون اور اس کی قوم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا۔ اس کے قرائن و دلائل کی تفصیل آیات کی تفسیر کے ذیل میں آئے گی۔

اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۳-۳۲

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ﴿۱۵﴾ قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸﴾ قَالُوْا طَآىِٕرُكُمْ مَّعَكُمْ ۭ اَىِٕنْ ذُكِّرْتُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۰﴾ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۲﴾ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ﴿۲۳﴾ اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾ اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿۲۵﴾ قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۭ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ

مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۷﴾ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ﴿۲۹﴾ يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۰﴾ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۲﴾

وقف غفران — ع ۲ — ترجمۂ آیات ۱۳-۳۲

اوران کو بستی والوں کی مثال سناؤ، جب کہ ان کے پاس فرستادے آئے۔ جب کہ ہم نے ان کے پاس دو رسول بھیجے تو لوگوں نے ان کی تکذیب کردی تو ہم نے ایک تیسرے سے ان کی تائید کی تو انھوں نے لوگوں سے کہا کہ ہم تمھارے پاس بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ لوگوں نے جواب دیا کہ تم تو بس ہمارے ہی جیسے بشر ہو! اور خدائے رحمان نے کوئی چیز بھی نازل نہیں کی ہے، تم لوگ بالکل جھوٹ دعویٰ کرتے ہو۔ ۱۳-۱۵

انھوں نے کہا کہ ہمارا رب گواہ ہے کہ ہم تمھاری طرف رسول ہو کر آئے ہیں۔ اور ہماری ذمہ داری بس واضح طور پر پہنچا دینے کی ہے۔ لوگوں نے کہا، ہم تو تمھیں منحوس سمجھتے ہیں، اگر تم لوگ باز نہ رہے تو ہم تم کو سنگسار کر چھوڑیں گے اور تم کو ہمارے ہاتھوں بڑا دکھ پہنچے گا۔ رسولوں نے جواب دیا کہ تمھاری نحوست تمھارے ساتھ ہے۔ کیا اس چیز کو تم نے نحوست سمجھا کہ تمھیں یاد دہانی کی گئی! بلکہ تم خود حدود سے گزر جانے والے لوگ ہو۔ ۱۶-۱۹

اور شہر کے پرلے سرے سے ایک شخص بھاگا ہوا آیا۔ اس نے کہا، اے میری قوم کے لوگو، رسولوں کی پیروی کرو۔ ان لوگوں کی پیروی کرو جو تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتے اور وہ

راہِ راست پر بھی ہیں ۔ اور میں کیوں نہ بندگی کروں اس ذات کی جس نے مجھ کو پیدا کیا اور اسی کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے! کیا میں اس کے سوا دوسروں کو معبود بناؤں! اگر خدائے رحمان مجھے کوئی تکلیف پہنچانی چاہے تو نہ ان کی سفارش میرے کچھ کام آئے گی اور نہ وہ مجھے چھڑا سکیں گے ۔ بے شک میں اس وقت ایک کھلی ہوئی گمراہی میں ہوں گا ۔ میں تمہارے رب پر ایمان لایا تو میری بات سنو ——— ارشاد ہوا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ ۔ اس نے کہا کاش، میری قوم جانتی کہ میرے رب نے مجھے بخش دیا اور مجھے عزت پانے والوں میں سے بنایا! ۲۰-۲۷

اور اس کے بعد اس کی قوم پر ہم نے آسمان سے کوئی فوج نہیں اتاری اور نہ ہم اتارنے والے ہی تھے ۔ بس ایک ڈانٹ تھی کہ دفعتہً وہ پامال ہو کے رہ گئے ۔ افسوس ہے بندوں کے حال پر! جو رسول بھی ان کے پاس آئے وہ ان کا مذاق ہی اڑاتے رہے ۔ کیا انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ کتنی قومیں ان سے پہلے ہوئی ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا، اب وہ ان کے پاس واپس آنے والی نہیں ۔ بے شک وہ سب ہمارے ہی حضور میں حاضر کیے جائیں گے ۔ ۲۸-۳۲

---

## ۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا أَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ إِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ (۱۳)

قریش کی عبرت کے لیے مصر کی مثال

'لَهُمْ' میں ضمیر کا مرجع قریش ہیں اور 'اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ' میں 'قَرْيَة' پر الف لام اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ بستی مخاطب کے لیے ایک معہود و معلوم بستی تھی ۔ آگے کے اشارات دلیل ہیں کہ اس سے مراد مصر ہے جس کی سرگزشت، مختلف اسلوبوں سے، قرآن میں، قریش کی عبرت پذیری کے لیے بیان ہوئی ہے اور جس کے حالات سے وہ واقف تھے ۔ 'اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ' سے اس بات کی طرف اشارہ ہے

کہ یہاں مقصود مخاطب کو اس وقت کے حالات کی طرف توجہ دلانا ہے جب ان کی طرف رسولوں کی بعثت ہوئی ہے۔ فرمایا کہ ان لوگوں کو اس بستی کی سرگزشت کی طرف توجہ دلاؤ کہ جو انجام اس بستی والوں کا ہوا وہی حال ان کا بھی ہوگا اگر انھوں نے انہی کی روش اختیار کی۔

إِذْ أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوا إِنَّا إِلَيْكُم مُّرْسَلُونَ (۱۴)

ایک تیسرے بندے سے رسولوں کی تائید

یہ 'إِذْ جَاءَهَا الْمُرْسَلُونَ' کے اجمال کی وضاحت ہو رہی ہے کہ پہلے ہم نے ان کی طرف دو رسول بھیجے تو انھوں نے ان کو جھٹلا دیا۔ پھر ہم نے ایک تیسرے بندے سے ان دونوں رسولوں کو کمک پہنچائی اور انھوں نے ان کو دعوت دی کہ ہم تمھارے پاس خدا کے بھیجے ہوئے آئے ہیں تو تم لوگ ہماری بات سنو اور مانو۔

'اثْنَيْنِ' سے مراد تو ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام ہیں۔ رسولوں کی تاریخ میں یہی ایک مثال ملتی ہے کہ کسی قوم کی طرف بیک وقت دو رسول اللہ تعالیٰ نے بھیجے۔ اس اہتمام خاص کے وجوہ کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے۔ جب فرعونیوں نے ان کی تکذیب کر دی تو اللہ تعالیٰ نے ایک تیسرے بندے کو ان رسولوں کی تائید کے لیے اٹھایا۔

تیسرے سے کون مراد ہے؟

اس تیسرے سے کون مراد ہے؟ میرے نزدیک اس سے وہ مومنِ آلِ فرعون مراد ہے جس کی جانبازیوں کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت کے ذیل میں یہاں بھی آگے ہوا ہے اور قرآن کے دوسرے مقامات، بالخصوص سورۂ مومن، میں بھی ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تائید و حمایت میں اس مردِ حق نے جو کچھ کیا ہے اور جس بے خوفی و جانبازی کے ساتھ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حیثیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت میں وہی تھی جو اس امت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہے۔ یہ اگرچہ اصطلاحی مفہوم میں رسول نہیں تھے لیکن جہاں تک رسولوں کی تائید و حمایت کا تعلق ہے اس کے لیے انھوں نے جان لڑا دی۔ چنانچہ الفاظِ قرآن سے خود یہ بات نکلتی ہے کہ ان کا ذکر یہاں ایک رسول کی حیثیت سے نہیں بلکہ رسولوں کے ایک خاص مددگار کی حیثیت سے ہوا ہے۔

آگے آیت ۲۰ میں ان کا تفصیل کے ساتھ تعارف بھی قرآن نے کرایا ہے اور ان کی وہ آخری یادگار تقریر بھی آ رہی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تائید میں انھوں نے کی ہے۔

اس تقریر اور تعارف پر غور کیجیے تو اس سے میرے قیاس کی تائید ہوگی۔

مثلاً یہاں ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے 'وَجَاءَ مِنْ أَقْصَا الْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَسْعَىٰ' (اور شہر کے دور کے حصہ سے ایک شخص بھاگا ہوا آیا) بعینہٖ انہی الفاظ میں ان کا تعارف سورۂ قصص آیت ۲۰ میں ہوا ہے۔ 'وَجَاءَ رَجُلٌ مِّنْ أَقْصَا الْمَدِينَةِ يَسْعَىٰ قَالَ يَا مُوسَىٰ إِنَّ الْمَلَأَ يَأْتَمِرُونَ بِكَ لِيَقْتُلُوكَ فَاخْرُجْ إِنِّي لَكَ مِنَ النَّاصِحِينَ' (اور ایک شخص شہر کے پرلے سرے سے بھاگا

ہوا آیا اور اس نے بتایا کہ اے موسٰی! اعیانِ حکومت تمہارے قتل کے مشورے کر رہے ہیں تو تم یہاں سے نکل جاؤ، میں تمہارے خیر خواہوں میں سے ہوں)۔ یہ اس موقع کا ذکر ہے جب حضرت موسٰی علیہ السلام کے ہاتھوں ایک مصری کے قتل کا واقعہ صادر ہو گیا تھا اور فرعون کے آدمی ان کے قتل کے مشورے کر رہے تھے۔ اس وقت اسی مردِ حق نے حضرت موسٰی علیہ السلام کو دشمنوں کی سازش سے آگاہ کیا اور ان کو کہیں نکل جانے کا مشورہ دیا۔ جس کے بعد حضرت موسٰی علیہ السلام نے مدین کو ہجرت فرمائی۔

ان کی جس تائید و حمایت کا یہاں حوالہ ہے اس کی ایک مثال تو یہیں آگے آرہی ہے۔ اس کے علاوہ قرآن نے ان کے متعدد کارناموں کا حوالہ دیا ہے۔ سورۂ مومن کی آیت ۲۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرعون کے خاص شاہی خاندان کے ایک فرد تھے لیکن نہایت حق پرست تھے۔ ان کو حضرت موسٰی علیہ السلام سے ان کی بعثت سے پہلے بھی نہایت ہمدردی تھی چنانچہ اوپر سورۂ قصص کا جو حوالہ نقل ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انھیں پتہ چلا کہ حضرت موسٰی علیہ السلام کی جان کو خطرہ ہے تو وہ چین سے بیٹھے نہیں رہے۔ بلکہ دوڑ سے بھاگے ہوئے حضرت موسٰیؑ کے پاس پہنچے اور ان کو خطرے سے آگاہ کیا ——— اسی طرح حضرت موسٰی علیہ السلام کے دعوائے نبوت کے بعد جب فرعون اور اس کے اعیان نے حضرت موسٰیؑ کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا تو اس مردِ حق نے بھرے دربار میں جو تقریر حضرت موسٰی علیہ السلام کی تائید میں کی وہ قرآن نے سورۂ مومن میں نقل کی ہے۔ ہم یہ تقریر اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ اس کو پڑھیے تو کچھ اندازہ ہوگا کہ ان کا مرتبہ و مقام کیا تھا اور ان کی اس تائید و حمایت (تعزیز) کی نوعیت کیا تھی جس کا قرآن نے یہاں حوالہ دیا ہے۔ سورۂ مومن کی آیات ۲۶ - ۴۵ سامنے رکھ لیجیے۔

"فرعون نے درباریوں سے کہا کہ تم لوگ مجھے موسٰی کو قتل کر لینے دو، اگر وہ سچا ہے تو اپنی مدد کے لیے اپنے رب کو بلائے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تمہارا دین بدل دے گا یا ملک میں فساد برپا کر کے رہے گا۔ موسٰی نے کہا میں ہر متکبر سے، جو روزِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا، اپنے اور تمہارے رب کی پناہ مانگتا ہوں۔

اور ایک مردِ مومن، جو فرعون کے خاندان میں سے تھا اور اب تک اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا، بولا کہ کیا تم لوگ ایک شخص کو محض اس گناہ میں قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے درآنحالیکہ وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے نہایت واضح نشانیاں لے کر آیا ہے! اگر وہ اپنے دعوے میں جھوٹا ہے تو اس کا وبال اسی پر آئے گا اور اگر وہ سچا ہے تو یاد رکھو کہ جس چیز سے وہ تم کو ڈرا رہا ہے اس کا کوئی حصہ تم کو پہنچ کے رہے گا۔ اللہ کبھی حد سے تجاوز کرنے والے اور جھوٹے کو بامراد نہیں کرتا۔ اے میری قوم کے لوگو! آج تم کو اس ملک میں اقتدار حاصل ہے لیکن کل اگر خدا کا عذاب ہم پر آ دھمکا تو خدا کے قہر سے ہم کو کون بچائے گا؟

فرعون نے کہا، میں تمھیں وہی رائے دے رہا ہوں جو میری سوچی سمجھی ہوئی رائے ہے اور یاد رکھو کہ میں بالکل ٹھیک راہ کی طرف تمھاری رہنمائی کر رہا ہوں۔

مرد مومن نے کہا، اے میری قوم کے لوگو! میں تم پر اسی طرح کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں جس طرح کا عذاب پچھلی قوموں —— نوح، عاد، ثمود کی قوموں اور ان کے بعد والوں —— پر آیا۔ اللہ بندوں کے لیے ظلم کو پسند نہیں کرتا۔

اے میری قوم کے لوگو، میں تم پر ایک بڑی ہلچل کے دن کا اندیشہ رکھتا ہوں جس دن تم پیٹھ پیچھے بھاگو گے۔ اور کوئی تم کو خدا کے غضب سے بچانے والا نہیں ہوگا۔ یاد رکھو کہ جس کو خدا گمراہ کر دے اس کو کوئی دوسرا راہ دکھانے والا نہیں بن سکتا۔ اس سے پہلے تمھارے پاس یوسف کھلی نشانیوں کے ساتھ آئے لیکن تم ان کی دعوت کی طرف سے برابر شک ہی میں رہے۔ یہاں تک کہ جب ان کی وفات ہو گئی تو تم یہ سمجھ بیٹھے کہ اللہ اب کوئی رسول نہیں بھیجے گا۔ اللہ حدود سے تجاوز کرنے والوں اور شکیوں کو اسی طرح گمراہی میں ڈال دیتا ہے۔ یعنی ان لوگوں کو جو بغیر کسی دلیل کے اللہ کی آیات کے بارے میں جھگڑتے ہیں، ایسے لوگ اللہ اور اہلِ ایمان کے نزدیک زیادہ مبغوض ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح ہر متکبر و جبار کے دل پر مہر کر دیا کرتا ہے۔

فرعون نے ہامان کو مخاطب کر کے کہا، اے ہامان! میرے لیے ایک محل بنواؤ تاکہ میں آسمانوں کے اطراف میں جھانک کر دیکھوں کہ موسیٰ کا رب کہاں ہے! میں تو اس کو بالکل جھوٹا سمجھتا ہوں ..............

مرد مومن نے کہا، اے میری قوم کے لوگو، میری پیروی کرو، میں تمھیں سیدھی راہ دکھا رہا ہوں۔

اے میری قوم کے لوگو! یہ دنیا کی زندگی تو چند روزہ ہے، اصل ٹھکانا تو آخرت ہے۔ جو کسی برائی کا ارتکاب کرے گا تو وہ اسی کے مطابق بدلہ پائے گا —— اور جو نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، تو یہی لوگ ہیں جو جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر بے حساب فضل ہوگا۔

اے میری قوم کے لوگو! کیا بات ہے کہ میں تو تمھیں نجات کی طرف بلا رہا ہوں اور تم مجھے دوزخ کی طرف بلا رہے ہو! تم مجھے دعوت دے رہے ہو کہ میں اللہ کا انکار کروں اور ایسی چیزوں کو اس کا شریک ٹھہراؤں جن کے باب میں مجھے کوئی علم نہیں اور میں تمھیں خدائے عزیز و غفار کی طرف دعوت دے رہا ہوں —— اس میں ذرا شبہ نہیں کہ تم جن کی طرف مجھے دعوت دے رہے ہو ان کی دہائی نہ دنیا میں کچھ نافع نہ آخرت میں۔ ہمارا لوٹنا اللہ کی طرف ہوگا اور حدود سے تجاوز کرنے والے جہنم کے ایندھن بنیں گے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کو بہت جلد تم یاد کرو گے۔ میں اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔

بے شک اللہ اپنے بندوں کا نگرانِ حال ہے۔ تو اللہ نے اس کو لوگوں کی بری سازشوں سے محفوظ رکھا اور آلِ فرعون کو بُرے عذاب نے گھیر لیا!"

تین کا تیسرا

اس مردِ بزرگ کی یہ پوری تقریر پڑھیے۔ یہ تقریر انھوں نے مصر کے دار الامراء (HOUSE OF LORDS) میں اعیانِ حکومت کے سامنے اس وقت کی ہے جب فرعون نے حضرت موسیٰ کے قتل کی تجویز پیش کی ہے اور اعیانِ حکومت کو اپنی تجویز سے متفق کرنا چاہا ہے۔ اس وقت تک انھوں نے اپنا ایمان پوشیدہ رکھا تھا لیکن جب یہ فیصلہ کن وقت آ گیا تو انھوں نے پردہ اٹھا دیا اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تائید اور حق کی حمایت میں، فرعون اور قوم کے تمام اعیان و اکابر کے سامنے، انھوں نے جو کچھ کہا ہے، جن دلائل کے ساتھ کہا ہے اور جس جرأت و بے خوفی کے ساتھ کہا ہے، اس کی مثال انبیاء اور صدیقین کی تاریخ کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتی۔ پھر یہ بات بھی یاد رکھیے کہ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں بلکہ خاندانِ شاہی کے ایک رکنِ رکین تھے اس وجہ سے ان کی اس نصیحت کو اعیانِ حکومت کسی اسرائیلی عصبیت پر محمول نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ پر تو انھوں نے یہ الزام لگایا کہ یہ اسرائیلیوں کو بغاوت پر ابھارنا چاہتے ہیں لیکن یہ صدائے حق جو انہی کے اندر کے ایک مردِ بزرگ کی طرف سے اٹھی، اس کے خلاف وہ اپنے عوام کے اندر کیا بدگمانی پھیلا سکتے تھے! ـــــ اس مردِ جلیل کا یہی وہ شاندار اور زندۂ جاوید کارنامہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے 'فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ' کے الفاظ سے ذکر فرمایا۔ یہ اس معنی میں تو رسول نہیں تھے جس معنی میں حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ رسول تھے لیکن ان کے سب سے زیادہ طاقتور، سب سے زیادہ جاں نثار اور سب سے بڑے وفادار و راستباز ساتھی ضرور تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو تین کے تیسرے کا درجہ دیا۔

'قَالُوْٓا اِنَّآ اِلَیْکُمْ مُّرْسَلُوْنَ'، یہ جمع کے صیغہ سے ان سب کا یہ کہنا کہ 'اِنَّآ اِلَیْکُمْ مُّرْسَلُوْنَ' اس امر کو مستلزم نہیں ہے کہ یہ تینوں حضرات ایک ہی درجہ کے رسول تھے بلکہ یہ بات علیٰ سبیل التغلیب ارشاد ہوئی ہے۔ ایک سفارت کے تمام ارکان ایک ہی درجہ و منصب کے نہیں ہوتے لیکن اصل ذمہ داری میں چونکہ سب شریک ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کو اس طرح اپنے کو لوگوں کے سامنے پیش کرنے کا حق ہوتا ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اصل رسول کی حیثیت تو صرف حضرت موسیٰؑ کو حاصل تھی۔ حضرت ہارونؑ بھی اصل رسول نہیں بلکہ حضرت موسیٰؑ کے وزیر تھے۔ اسی طرح اس مردِ ثالث کی حیثیت رسول کی نہیں بلکہ ان رسولوں کے سب سے بڑے جاں نثار و مددگار کی تھی لیکن انھوں نے حضرت موسیٰؑ کی دعوت کی پوری ذمہ داری اپنے اوپر لے لی تھی اور اپنی قوم کو غلط کار لیڈروں کی پیروی سے روک کر حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ اور اپنی پیروی کی دعوت دے رہے تھے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اسی زمرے میں شمار فرمایا۔

قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَیْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا

تَکۡذِبُوۡنَ (۱۵)

فرعونیوں کا پامال اعتراض

یہ وہی اعتراض ہے جو ہر رسول کے مکذبین نے اپنے اپنے رسولوں کے خلاف اٹھایا ہے کہ تم تو ہمارے ہی جیسے انسان ہو تو تم خدا کے رسول کیسے ہوئے! اگر خدا کو کوئی رسول بھیجنا ہوتا تو کسی برتر مخلوق کو رسول بناتا نہ کہ ہمارے ہی جیسے انسانوں کو۔ یہ اعتراض قرآن میں رسولوں کے مکذبین کی زبان سے بار بار نقل ہوا ہے۔ فرعون اور اس کے اعیان کو بھی حضرت موسیٰؑ پر یہ اعتراض تھا اور یہی اعتراض قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بھی اٹھایا تھا۔

وَمَآ اَنۡزَلَ الرَّحۡمٰنُ الاٰیۃ۔ یعنی تمہارا یہ دعویٰ کہ خدا نے تم پر کوئی کتاب یا وحی نازل کی ہے، بالکل جھوٹ ہے۔ خدا نے کوئی چیز بھی نازل نہیں کی ہے۔

قَالُوۡا رَبُّنَا یَعۡلَمُ اِنَّآ اِلَیۡکُمۡ لَمُرۡسَلُوۡنَ ہ وَمَا عَلَیۡنَآ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ (۱۶-۱۷)

اعتراض کا جواب اور تنبیہ

رَبُّنَا یَعۡلَمُ قسم کے مفہوم میں آتا ہے۔ اس کی وضاحت ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں۔ ان کی تکذیب کے جواب میں انھوں نے قسم کے ساتھ فرمایا کہ ہم تمہارے پاس خدا کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ جس طرح آیت ۱۴ میں مُرۡسَلُوۡنَ علیٰ سبیل التغلیب آیا ہے اسی اسلوب پر یہاں بھی جمع آیا ہے۔

وَمَا عَلَیۡنَآ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ۔ یہ ان کی طرف سے لوگوں کو تنبیہ ہے کہ اگر تم ہم کو جھٹلاتے ہو تو جھٹلاؤ۔ ہمارے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ذمہ داری ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہم تم کو خدا کی بات نہایت واضح طور پر پہنچا دیں۔ تمہارے دلوں میں ایمان اتار دینا ہماری ذمہ داری نہیں ہے۔ اگر تم نے ہماری بات نہ مانی تو اس کا انجام خود بھگتو گے۔ ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں گے۔

قَالُوۡۤا اِنَّا تَطَیَّرۡنَا بِکُمۡ ۚ لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَہُوۡا لَنَرۡجُمَنَّکُمۡ وَلَیَمَسَّنَّکُمۡ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِیۡمٌ (۱۸)

لفظ 'تطیّر' کی تحقیق اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔ یہاں یہ بری فال لینے اور کسی کو منحوس سمجھنے کے مفہوم میں ہے۔

فرعونیوں کی طرف سے حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں پر نحوست کا الزام

یعنی ان رسولوں کی دعوت کے زمانے میں اہل مصر پر جو آفتیں، ان کی تنبیہ کے لیے نازل ہوئیں ان سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے انھوں نے ان کو حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیا اور کہا کہ یہ آفتیں ہمارے اعمال کے سبب سے ہم پر نہیں آ رہی ہیں، جیسا کہ موسیٰؑ اور ان کے ساتھی دعویٰ کر رہے ہیں بلکہ یہ ان کی اس گمراہ کن دعوت کے نتیجہ میں پیش آ رہی ہیں جس سے ہمارے دیوتا ناراض ہیں۔ ساتھ ہی ان کو دھمکی بھی دی کہ اگر تم لوگ اس بدعقیدگی کی اشاعت سے باز نہ آئے تو ہم اپنے دیوتاؤں کی حرمت کی حفاظت کے لیے تم کو سنگسار کر دیں گے اور اس کے علاوہ بھی بہت سے دکھ تم کو ہمارے ہاتھوں جھیلنے پڑیں گے۔ یہ مضمون سورۂ اعراف میں بھی گزر چکا ہے۔ فرمایا ہے: وَلَقَدۡ اَخَذۡنَآ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ بِالسِّنِیۡنَ وَنَقۡصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّہُمۡ یَذَّکَّرُوۡنَ ہ فَاِذَا جَآءَتۡہُمُ الۡحَسَنَۃُ

قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ (۱۳۰-۱۳۱)

(اور ہم نے قوم فرعون کو قحط اور پھلوں کی کمی میں مبتلا کیا کہ وہ نصیحت حاصل کریں تو جب ان کے حالات اچھے ہوتے کہتے کہ یہ تو ہمارا حق ہی ہے اور اگر ان کو کوئی آفت پہنچتی تو اس کو موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیتے)۔

قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ۭ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ (۱۹)

نحوست آدمی کے اپنے اعمال کے اندر ہوتی ہے

لفظ 'طائر' کی تحقیق بھی اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ یہاں اس کے معنی نحوست کے ہیں۔ یہ ان رسولوں کا جواب ہے کہ تم اپنی بدبختی کے اسباب دوسروں کے اندر ڈھونڈتے ہو حالانکہ تمہاری نحوست خود تمہارے ساتھ ہے۔ یہ جو کچھ پیش آ رہا ہے تمہارے اپنے ہی عقائد و اعمال کا نتیجہ ہے اس وجہ سے دوسروں کو ملزم ٹھہرانے کے بجائے اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھو اور اپنے اعمال و عقائد کا جائزہ لو۔

'اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ' یعنی تم ہمیں جو منحوس ٹھہرا رہے ہو تو کیا اس گناہ میں کہ ہماری طرف سے تم کو یاددہانی کی گئی اور نیک و بد سے آگاہ کیا گیا ہے!

'بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ' یعنی یہ تمہاری سرکشی و بدبختی کی انتہا ہے کہ خدا کے حدود کو توڑ کر اپنے لیے خطرات کو دعوت دیتے ہو پھر خدا کے جو بندے تمہیں ان خطرات سے آگاہ کرتے ہیں ان کے شکرگزار ہونے کے بجائے اُلٹے انہی کو ان خطرات کا سبب قرار دیتے ہو۔

وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ۙ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (۲۰-۲۱)

تیسرے منذر کی طرف سے تائید حق

اوپر آیت ۱۴ میں جس تیسرے منذر کی طرف اشارہ ہے یہ اس کی تائید حق کی تفصیل ہے۔ اوپر سورۂ اعراف کی آیت کے حوالہ سے ہم بیان کر چکے ہیں کہ 'رَجُلٌ' سے مراد وہی مومن آل فرعون ہے جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ سورۂ مومن میں ہوا ہے اور جس کی تقریر کا حوالہ ہم اوپر دے چکے ہیں — اس کا واضح قرینہ یہ ہے کہ جن الفاظ میں ان کا تعارف یہاں کرایا گیا ہے بعینہٖ انہی الفاظ میں سورۂ اعراف میں بھی کرایا گیا ہے۔

'جَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى' سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت موسیٰ کے ساتھ ان کی ہمدردی محض لفظی نہیں بلکہ عملی تھی۔ اپنے خس خانوں میں بیٹھے بیٹھے تو بہت سے لوگ کسی مقصد حق اور مرد حق کی تعریف تحسین کر دیتے ہیں لیکن ایسے افراد، بالخصوص امرا و اغنیاء کے طبقہ میں بہت کم نکلتے ہیں جو عملاً اس حق کے لیے سرگرمی دکھائیں۔ لیکن اس مرد حق کا حال اس سے مختلف تھا۔ ان کا مکان شہر کے ایک بعید کنارے پر تھا، جیسا کہ لفظ 'اقصیٰ' سے واضح ہوتا ہے، لیکن جب بھی انھوں نے یہ محسوس فرمایا ہے کہ حضرت موسیٰ کو کوئی خطرہ درپیش ہے تو وہ بھاگ کر، جیسا کہ لفظ 'یسعیٰ' سے واضح ہوتا ہے، وہاں پہنچے ہیں اور اپنے تمام خاندانی

مفادات بلکہ اپنی جان تک خطرے میں ڈال کر ان کے لیے سپر بن گئے ہیں۔ اسی طرح کے ایک موقع کا حوالہ قرآن نے یہاں دیا ہے اور قرینہ دلیل ہے کہ یہ وہی موقع ہے جب انھوں نے فرعون کے سامنے وہ تقریر فرمائی ہے جو پیچھے ہم نقل کر آئے ہیں۔ آگے کی آیات سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

مردِ مومن کی تقریر، اجمالی حوالہ

'قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ' یہ اس تقریر کا اجمالی حوالہ ہے جو انھوں نے فرعون اور اس کے اعیان کے سامنے کی ہے۔ 'اِتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ' میں 'مُرْسَلِيْنَ' سے ان کا اشارہ زمرۂ مرسلین کی طرف ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اپنے کو بھی اصطلاحی مفہوم میں ایک رسول سمجھتے رہے ہوں۔ ان کے اس ارشاد میں اصل زور اس بات پر ہے کہ قوم کے لوگوں کو فرعون، ہامان، قارون اور اس قسم کے مفسد لیڈروں کے پیچھے چلنے کے بجائے ان لوگوں کے پیچھے چلنا چاہیے جن کو خدا نے لوگوں کی رہنمائی کے لیے بھیجا ہے یا جو لوگ ان کا ساتھ دے رہے اور ان کی پیروی کر رہے ہیں۔

رسولوں کے حق میں دو واضح دلیلیں

'اِتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا الاٰيۃ' یہ رسولوں کی پیروی کے حق میں دو دلیلیں ہیں۔ ایک یہ کہ ان رسولوں کا اس دعوت کے ساتھ کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہیں ہے بلکہ وہ ہر غرض سے بالاتر ہو کر محض خلق کی ہدایت کے لیے یہ سارے دکھ جھیل رہے ہیں۔ برعکس اس کے دوسرے لیڈر جو اس دعوتِ حق کی مخالفت کر رہے ہیں وہ محض اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔

دوسری دلیل انھوں نے یہ دی کہ 'وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ'۔ یہ رسول بے غرض ہونے کے ساتھ ساتھ ہدایت پر بھی ہیں۔ اس دلیل سے یہ بات نکلتی ہے کہ بے غرضی ایک شخص کی نیک نیتی کی شہادت تو ضرور ہے لیکن مجرد نیک نیتی اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ وہ حق پر بھی ہے۔ اس وجہ سے کسی شخص کی نیک نیتی اور بے غرضی کے ساتھ ساتھ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس کی بات عقل و منطق کے معیار پر بھی پوری اترتی ہے یا نہیں۔ اگر وہ بے غرض بھی ہے اور اس کی دعوت عقل و منطق کی رو سے بھی صحیح ہے تو اس کی پیروی نہ کرنا بدبختی ہے۔

وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ۝ اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ (۲۲-۲۵)

قوم کے لیڈروں کی ملامت کا جواب

اندازِ کلام دلیل ہے کہ یہ بات انھوں نے قوم کے لیڈروں کی ملامت کے جواب میں فرمائی ہے۔ جب انھوں نے کھلم کھلا لوگوں کو رسولوں کی پیروی کی دعوت دی ہوگی تو ظاہر ہے کہ مفاد پرست لیڈروں نے ان کو قوم اور دینِ آبائی کا دشمن ٹھہرایا ہوگا۔ ان کے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ آخر اس کی بندگی میں کیوں نہ کروں جس نے مجھے وجود بخشا اور جس کی طرف تم سب کو لوٹنا ہے۔ 'وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ' میں خطاب کا صیغہ تنبیہ کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج جس رب کی بندگی سے تم لوگ اس شد و مد کے ساتھ مجھے روک

رب ہے ہو ایک دن پیشی سب کی اسی کے حضور میں ہونی ہے اور تمھیں اس کے آگے جواب دہی کرنی ہے۔

ءَ اَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً الاٰیۃ، یعنی یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں تمھارے کہنے سے ایسی چیزوں کو معبود بناؤں جن کی بے بسی کا یہ حال ہے کہ اگر خدا مجھے کوئی دکھ پہنچانا چاہے تو نہ ان کی سفارش میرے لیے کچھ نافع ہو سکتی ہے اور نہ وہ بذاتِ خود ہی یہ حیثیت رکھتے کہ مجھے اس دکھ سے نجات دے سکیں!

اِنِّیْٓ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ، یعنی اگر میں ایسا کروں تو یہ ایسی کھلی ہوئی گمراہی ہوگی جس کے لیے میرے پاس کوئی عذر نہ ہوگا۔

اِنِّیْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ: یہ قوم کو فیصلہ کن اور دندان شکن جواب ہے کہ تم لوگ اچھی طرح کان کھول کر میری یہ بات سن لو کہ میں تمھارے رب پر ایمان لایا۔ مطلب یہ ہے کہ اب مجھے اس راہ سے ہٹانے کی کوشش میں اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے بہتر ہے کہ تم خود بھی یہی راہ اختیار کرو جو میں نے اختیار کی ہے اور اسی رب پر ایمان لاؤ جس پر میں ایمان لایا ہوں اس لیے کہ فی الحقیقت وہی تمھارا بھی رب ہے۔ اگر تم اس سے مجھے برگشتہ کرنے کی کوشش کرو گے تو اپنے رب ہی سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرو گے۔

قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۭ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ (۲۶ - ۲۷)

دشمنوں کے شر سے حفاظت کی بشارت

مذکورہ اعلان کے بعد ظاہر ہے کہ ان کی پوری قوم ان کی دشمن بن کر ان کے خلاف سازشوں میں لگ گئی ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو سازشوں کے شر سے محفوظ رکھا اور حمایتِ حق کی راہ میں انھوں نے یہ بازی جو کھیلی اس کے صلہ میں ان کو جنت کی بشارت دی گئی جس پر انھوں نے اس تمنا کا اظہار فرمایا کہ کاش میری قوم بھی اس بات کی قدر و قیمت جانتی جس کے صلہ میں مجھے یہ مغفرت اور سرفرازی حاصل ہوئی۔

یہاں اس بات کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ یہ بشارت ان کو کس موقع پر دی گئی ہے۔

کلام کے سیاق و سباق پر غور کرنے سے تین امکان سامنے آتے ہیں۔

ایک یہ کہ ان کے اس اعلان کے بعد قوم کے اشرار نے ان کو شہید کر دیا اور اس وقت ان کو یہ بشارت دی گئی ہو۔

دوسرا یہ کہ اس کے بعد انھوں نے قوم کے رویہ سے مایوس ہو کر ہجرت فرمائی ہو اور اس وقت ان کو یہ بشارت ملی ہو۔

تیسرا یہ کہ اس کے بعد چونکہ ان کا مشن پورا ہو چکا تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس بشارت کے ساتھ ان کو وفات دی ہو۔

ان میں سے پہلا امکان کلام کے سیاق و سباق کی روشنی میں اگرچہ زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے لیکن سورۂ مومن کے حوالے سے اوپر ہم نے ان کی جو تقریر نقل کی ہے اس کے آخر میں یہ تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے ان کو قوم کی سازشوں کے شر سے محفوظ رکھا۔ ان کے وداعی کلمات کے بعد ان کی حفاظت کا ذکر یوں ہوا ہے:

فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ۚ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْۗءُ الْعَذَابِ ۝ (المؤمن: ۴۴-۴۵)

(اے میری قوم کے لوگو!) میں جو کچھ تم سے کہہ رہا ہوں اس کو تم عنقریب یاد کرو گے۔ میں اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔ بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حالات کو دیکھنے والا ہے۔ پس اللہ نے اس کو ان سازشوں کی آفات سے محفوظ رکھا جو لوگوں نے اس کے خلاف کیں اور آلِ فرعون کو برے عذاب نے گھیر لیا۔

اس آیت کی روشنی میں یہ امکان تو خارج از بحث ہو جاتا ہے کہ ان کو قتل کیا گیا ہو البتہ مذکورہ بالا دو امکان باقی رہ جاتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان دو میں سے کون سی صورت پیش آئی۔ اس کا صحیح علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ بس اتنی بات یقینی ہے کہ حق کی حمایت میں جو جاں بازی انھوں نے دکھائی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا انعام ان کو یہ ملا کہ اسی دنیا میں 'مبشر بالجنۃ' قرار پائے۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰي قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَاۗءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ۝ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ (۲۸-۲۹)

'مِنْۢ بَعْدِهٖ' میں مذکورہ بالا دو باتوں کا امکان ہے۔ ان کی موت کے بعد یا ان کی ہجرت کے بعد۔

رسولوں کے مکذبین کے لیے سنتِ الٰہی

یہ اس سنتِ الٰہی کا حوالہ ہے جس سے مکذبین کو لازماً سابقہ پیش آتا ہے جب کہ رسول اور اس کے ساتھی قوم کو چھوڑ کر ہجرت کر جاتے ہیں۔ فرمایا کہ اس کے بعد ہمیں اس کی قوم کو پامال کرنے کے لیے آسمان سے کوئی فوج نہیں اتارنی پڑی بلکہ ہماری ایک ہی ڈانٹ میں وہ پامال ہو کے رہ گئے۔ لفظ 'صیحۃ' عذاب کی تعبیر ہے۔ 'وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ' سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ان کے لیے آسمان سے کوئی فوج نہ اتارنے کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کے کاموں کے لیے ہم اپنی فوجیں نہیں اتارا کرتے، بس ہماری ایک ڈانٹ ہی کافی ہو جاتی ہے۔

یہ حقیقت بھی نگاہ میں رہے کہ ہر چند یہ عذاب اصلاً حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ کی تکذیب کے نتیجہ میں آیا لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے اس کو اس بندۂ مومن کی تکذیب کے نتیجہ کی حیثیت سے ذکر فرمایا ہے۔ اس سے رسول کے ساتھیوں کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ان کا یہ درجہ ہوتا ہے کہ ان کی تکذیب رسول کی تکذیب کے ہم معنی بن جاتی ہے اور اس کا وہی انجام ہوتا ہے جو رسول کی تکذیب کا ہوتا ہے۔

**ایک شبہ کا ازالہ**

ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ حضرت موسیٰؑ کے مکذبین —— فرعون اور اس کی قوم —— پر جو عذاب آیا اس کی شکل تو یہ ہوئی کہ فرعون اپنی تمام فوج سمیت دریا میں غرق کر دیا گیا لیکن یہاں جس عذاب کا ذکر ہے اس میں غرق کے واقعہ کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے بلکہ الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پر بھی کوئی اسی طرح کا عذاب آیا جس طرح کا عذاب عاد و ثمود اور دوسری پچھلی قوموں پر آیا جس کا اندیشہ اس مردِ مومن نے اپنی اس تقریر میں ظاہر کیا تھا جو سورۂ مومن کے حوالے سے اوپر نقل ہوئی ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ فرعون اور اس کی قوم پر دونوں قسم کے عذاب آئے —— ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی فوجوں کو ایک سائیکلونی طوفان کے ذریعے سے سمندر میں غرق کر دیا، دوسری طرف رعد و برق اور زلزلہ کے عذاب نے مصر کی تمام تعمیرات اور اس کے سارے باغ و چمن تاراج کر دیے۔ اس دوسرے عذاب کا ذکر تورات میں نہیں ہے لیکن قرآن میں اس کا ذکر نہایت واضح الفاظ میں ہے —— مثلاً فرمایا ہے:

| | |
|---|---|
| وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ (الاعراف: ۱۳۷) | اور ہم نے تاراج کر دیے وہ سب کچھ جو فرعون اور اس کی قوم کے لوگ بناتے رہے تھے اور ان کے انگوروں کے وہ باغ بھی جن کو وہ ٹٹیوں پر چڑھاتے تھے۔ |

یہی بات سنتِ الٰہی کے مطابق بھی ہے۔ رسول کی تکذیب کے نتیجہ میں جو عذاب کسی قوم پر آیا ہے اس نے قوم کے قومی وجود کی جڑ کاٹ دی ہے۔ یہ بات مجرد فرعون اور اس کی فوجوں کے غرق ہونے سے نہیں پوری ہو سکتی تھی۔ یہ اسی طرح کے کسی عذاب سے پوری ہو سکتی تھی جس کی طرف سورۂ اعراف کی مذکورہ بالا آیت اشارہ کر رہی ہے۔ اسی کا ذکر یہاں آیت زیرِ بحث میں ہے۔

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ (۳۰)

**مکذبینِ رسول کی بدبختی پر اظہارِ افسوس**

یہ مکذبینِ رسول کی بدبختی پر اظہارِ افسوس ہے کہ ہمیشہ سے لوگوں کا حال یہی رہا ہے کہ جب اللہ نے ان کی ہدایت کے لیے کوئی رسول بھیجا تو لوگوں نے ان کا مذاق اڑایا ہے اور پھر اس کے انجام بد سے دوچار ہوئے ہیں۔ چنانچہ جو روش فرعون اور اس کی قوم نے اپنے رسولوں کے ساتھ اختیار کی آج وہی روش قریش نے اپنے رسول اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ اختیار کی ہے اور لازماً یہ بھی اسی انجام سے دوچار ہوں گے جس سے ان کے پیشرو دوچار ہوئے۔ رسول، خدا کی سب سے بڑی رحمت بن کر آتا ہے لیکن اس کو مذاق بنا لیا جائے تو پھر اس سے بڑی نقمت بھی کوئی نہیں ہے۔

أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُونِ أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝ وَإِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ (۳۱-۳۲)

یہ قریش کو رسولوں کے ساتھ استہزا کا انجام دکھانے کے لیے ماضی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ کھیل جو وہ کھیل رہے ہیں یہ ایک نہایت خطرناک کھیل ہے۔ یہ کھیل کھیلنے والی قومیں اس دنیا سے اس طرح مٹی ہیں کہ اب وہ کبھی واپس آنے والی نہیں ہیں۔ بلکہ اب ان سب کی حاضری ہمارے ہی سامنے ہونی ہے اور ہم ہی ان کا حساب کریں گے۔

لَمَّا کا خاص استعمال

وَإِنْ كُلٌّ لَّمَّا' میں 'لَمَّا' اسی طرح کا ہے جس طرح سورۂ طارق میں ہے اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ (بے شک ہر جان پر ایک نگران مامور ہے)، یہ 'اِنْ' مخففہ ہے اور 'ل' اس کا قرینہ ہے چونکہ جملہ میں کچھ صوتی خلا رہ جاتا ہے اس وجہ سے اس کو بھرنے کے لیے اس کو 'لَمَّا' کر دیتے ہیں۔ معنی پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔

## ۴- آگے کا مضمون۔ آیات ۳۳-۵۰

آگے آفاق کی نشانیوں سے رسول کی دعوت اور اس کے انذار کی تائید کی ہے اور ان لوگوں کو تنبیہ فرمائی ہے جو کائنات کی ان تمام نشانیوں سے آنکھیں بند کیے ہونے کسی نئی نشانی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ گویا اوپر کی تاریخی شہادت کے بعد کلام از سرِ نو تمہید سے متصل ہو گیا ہے جس میں یہ بات فرمائی گئی تھی کہ ان کی اصلی بیماری یہ ہے کہ اشکبار ان کو اوپر یا نیچے کی کسی نشانی کی طرف متوجہ نہیں ہونے دے رہا ہے ورنہ ان کے آگے اور پیچھے نشانیوں کی کمی نہیں ہے۔ ان کے اس رویہ اور اس کے انجام کی مثال قومِ فرعون سے دینے کے بعد پھر ان کو آسمان و زمین کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۳-۵۰

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚۖ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ﴿۳۴﴾ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ۚ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۚۖ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۳۸﴾ وَالْقَمَرَ

قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ﴿۳۹﴾ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ
لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ
يَّسْبَحُوْنَ ﴿۴۰﴾ وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ
الْمَشْحُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَاِنْ نَّشَاْ
نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا
وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۴۴﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ
وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ
رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا
رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَاۗءُ
اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ڰ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۷﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا
الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾ مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً
تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ﴿۴۹﴾ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى
اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۰﴾

ع ۳ ۱۸ ۲

ترجمہ آیات ۳۳-۵۰

اور ایک بہت بڑی نشانی ان کے لیے مردہ زمین ہے۔ اس کو ہم نے زندہ کیا اور
اس سے غلے اُگائے پس اس میں سے وہ کھاتے ہیں۔ اور اس میں ہم نے کھجوروں اور
انگوروں کے باغ لگائے اور اس میں چشمے جاری کر دیے کہ وہ اس کے پھل کھائیں، اور
یہ ان کے ہاتھوں کی کارگزاری نہیں ہے تو کیا وہ شکر نہیں کرتے! ۳۳-۳۵
پاک ہے وہ ذات جس نے تمام قسمیں پیدا کیں ان چیزوں میں سے بھی جن کو زمین اگاتی

ہے اور خود ان کے اندر سے بھی اور ان چیزوں میں سے بھی جن کو وہ نہیں جانتے ۔ ۳۶

اور ان کے لیے ایک بہت بڑی نشانی رات ہے۔ ہم اس سے دن کو کھینچ لیتے ہیں پس وہ دفعتہً اندھیرے میں رہ جاتے ہیں اور سورج اپنے ایک معین مدار پر گردش کرتا ہے، یہ خدائے عزیز و علیم کی منصوبہ بندی ہے! اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں ٹھہرا دی ہیں یہاں تک کہ وہ کھجور کی پرانی ٹہنی کے مانند ہو کے رہ جاتا ہے۔ نہ سورج کی مجال ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت کر سکتی۔ ہر ایک اپنے خاص دائرے میں گردش کرتا ہے۔ ۳۷-۴۰

اور ان کے لیے ایک بہت بڑی نشانی یہ ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا اور ان کے لیے اسی کے مانند (خشکی میں بھی) چیزیں پیدا کیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں۔ اور اگر ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں پھر نہ ان کا کوئی فریاد رس ہو گا اور نہ ان کو نجات مل سکے گی۔ بس یہ ہماری رحمت اور ایک وقتِ معین تک ان کو بہرہ مند کرنا ہے۔ ۴۱-۴۴

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز سے ڈرو جو تمہارے آگے اور پیچھے ہے کہ تم پر رحم کیا جائے (تو وہ اعراض کرتے ہیں) اور ان کے رب کی نشانیوں میں سے جو نشانی بھی ان کے پاس آتی ہے وہ اس سے اعراض ہی کرنے والے بنے رہتے ہیں۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ تم کو رزق بخشا ہے اس میں سے خرچ کرو تو جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ کیا ہم ان لوگوں کو کھلائیں جن کو خدا چاہتا تو کھلاتا! یہ تو تم لوگ ایک صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہو! ۴۵-۴۷

اور وہ پوچھتے ہیں کہ یہ دھمکی کب پوری ہو گی اگر تم لوگ سچے ہو! یہ لوگ بس ایک ڈانٹ ہی کے منتظر ہیں جو ان کو آ پکڑے گی اور وہ جھگڑتے ہی رہ جائیں گے! پس نہ تو وہ کوئی وصیت کر پائیں گے اور نہ اپنے لوگوں کے پاس لوٹ ہی سکیں گے۔

۴۸ - ۵۰

## ۵ - الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاٰیَۃٌ لَّھُمُ الْاَرْضُ الْمَیْتَۃُ ۚ اَحْیَیْنٰھَا وَاَخْرَجْنَا مِنْھَا حَبًّا فَمِنْہُ یَاْکُلُوْنَ ۝ وَجَعَلْنَا فِیْھَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِیْھَا مِنَ الْعُیُوْنِ ۝ لِیَاْکُلُوْا مِنْ ثَمَرِہٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْہُ اَیْدِیْھِمْ ؕ اَفَلَا یَشْکُرُوْنَ (۳۳-۳۵)

دلیل ربوبیت سے توحید، خدا کی شکرگزاری اور اس کی عبادت کا مطالبہ

یہ سب سے پہلے زمین کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مردہ زمین کی از سرِ نو زندگی سے قیامت، توحید اور آسمانی ہدایت کے نزول پر جن گوناگوں پہلوؤں سے استشہاد کیا ہے اس کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے۔ یہاں ربوبیت کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے اور پھر خدا کی شکر گزاری کے حق کا مطالبہ کیا ہے جو بندوں پر لازماً عائد ہوتا ہے۔ اس شکر کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ بندے تنہا اپنے رب ہی کی بندگی کریں اس لیے کہ ان نعمتوں میں سے کوئی نعمت بھی نہ تو انسان کی اپنی سعی و تدبیر سے وجود میں آئی ہے اور نہ کوئی دوسرا ان کو وجود میں لانے والا بنا ہے۔

وَاٰیَۃٌ لَّھُمُ الْاَرْضُ الْمَیْتَۃُ۔ لفظ آیۃ کی تنکیر تفخیم شان پر دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو اگر کسی نشانی کی طلب ہے تو اس کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے لیے ایک سب سے بڑی نشانی ان کے پاؤں کے نیچے بچھی ہوئی یہ زمین ہی ہے۔ یہ بالکل مردہ ہوتی ہے، ہم اپنی بارش بھیج کر اس کو زندہ کرتے اور پھر اس سے غلے پیدا کرتے ہیں اور ان غلوں ہی پر ان کی معاش کا انحصار ہے۔ پھر یہ غور کریں تو ان کو معلوم ہو گا کہ ہم نے ان کی معاش کے لیے صرف غلے ہی کا انتظام نہیں کیا ہے بلکہ ہم نے اس میں ان کے لیے کھجور اور انگور اور دوسرے پھلوں کے باغ بھی اگائے ہیں اور ان باغوں کو شاداب رکھنے کے لیے چشمے بھی جاری کر دیے ہیں۔

لِیَاْکُلُوْا مِنْ ثَمَرِہٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْہُ اَیْدِیْھِمْ ؕ اَفَلَا یَشْکُرُوْنَ۔ یہ اس تمام اہتمام ربوبیت کا حق بیان فرمایا ہے کہ یہ سارا اہتمام ہم نے اس لیے کیا کہ بندے ہماری نعمتوں سے بہرہ مند ہوں اور اس امر پر دھیان کریں کہ یہ ان کے ہاتھوں کی کارفرمائی نہیں ہے بلکہ ایک رب رحیم و کریم و منعم کی بخشش ہے

جس نے ان کو بغیر کسی استحقاق کے ان نعمتوں سے بہرہ مند کیا ہے کہ وہ اس کے شکر گزار و فرمانبردار بنیں۔ لیکن ان کی ناسپاسی کا یہ حال ہے کہ یہ تمام نعمتوں سے فائدہ تو اٹھا رہے ہیں لیکن جب ان کو خدا کی شکرگزاری کی دعوت دی جاتی ہے تو اکڑتے اور نشانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔

زبان کا ایک خاص اسلوب

'مِنْ ثَمَرِہٖ' کی ضمیر کے مرجع کے بارے میں اہل تاویل کا اختلاف ہے۔ اکثر لوگوں نے اس کا مرجع اللہ تعالیٰ کو مانا ہے۔ (یعنی لوگ اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے پھل کھائیں اور اس کے شکر گزار رہیں) اس تاویل میں مجھے تکلف محسوس ہوتا ہے۔ اوپر سے اسلوب کلام متکلم کا چلا آ رہا ہے اس وجہ سے اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے یہاں 'مِنْ ثَمَرِہٖ' کے بجائے 'مِنْ ثَمَارِنَا' یا اس کے ہم مطلب کوئی اور اسلوب ہوتا اگرچہ یہ بھی کچھ موزوں نہ ہوتا۔ میرے نزدیک اس ضمیر کا مرجع 'ارض' ہی ہے جس کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے لیکن اس کے لیے یہاں ضمیر مذکر اس اسلوب پر آئی ہے جس کو اہل ادب 'علیٰ سبیل التاویل' سے تعبیر کرتے ہیں۔ عربی زبان میں یہ قاعدہ ہے کہ بعض مرتبہ ضمیر لفظ کے ظاہر کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس کے مفہوم کے اعتبار سے آتی ہے۔ اس کی متعدد مثالیں پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔ یہاں 'ارض' کے لیے مذکر ضمیر استعمال کر کے یہ اشارہ فرما دیا کہ اس سے 'بلد طیب' مراد ہے۔ اس لیے کہ بارش ہونے کو تو ہر خشک و تر اور ہر بنجر اور زرخیز زمین پر ہوتی ہے لیکن بار آور وہی زمین ہوتی ہے جو زرخیز ہوتی ہے۔ یہ مضمون سورۂ اعراف میں اس طرح بیان ہوا ہے۔ 'وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۚ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا' (اعراف: ۵۸) (اور جو زمین زرخیز ہوتی ہے اس کی نباتات تو اس کے رب کے حکم سے خوب اگتی ہیں اور جو زمین ناقص ہوتی ہے اس سے ناقص ہی چیز اگتی ہے)۔

'وَمَا عَمِلَتْهُ أَيْدِيهِمْ' یہ جملہ معترضہ کے محل میں ہے اور یہ ایک نہایت اہم یاددہانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان پھلوں کو کھائیں اور یہ یاد رکھیں کہ ان کو وجود میں لانے والے وہ نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہے۔ اسی حقیقت کا تذکر آدمی کے اندر شکر کا جذبہ ابھارتا ہے اور یہی شکر تمام دین کی بنیاد ہے۔ جو لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں وہ اللہ کی نعمتوں کو اپنے استحقاق اور اپنی قابلیت و صلاحیت کا کرشمہ سمجھتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ خدا کے شکر گزار بندے بننے کے بجائے استکبار میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ استکبار اپنی فطرت کے اعتبار سے شرک اور تمام فساد فی الارض کا پیش خیمہ ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ (۳۶)

توحید پر استدلال

لفظ 'ازواج' انواع و اقسام کے معنی میں بھی آتا ہے اور جوڑے جوڑے کے مفہوم میں بھی۔ یہاں یہ دونوں ہی معنوں کا جامع ہے۔ زمین سے جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں ان کو دیکھیے تو ان کے اندر گوناگونی اور تنوع بھی ہے اور ہر چیز جوڑے جوڑے کی شکل میں بھی نظر آتی ہے۔ اسی طرح انسانوں کو دیکھیے تو ان کی شکلوں، رنگوں، قامتوں اور زبانوں میں عظیم فرق نظر آئے گا اور ساتھ ہی ان کے اندر جوڑے جوڑے

ہونے کا وصف بھی پایا جاتا ہے۔ یہی حال اس عالم کے اس حصہ کا ہے جو ہمارے علم کی رسائی سے باہر ہے۔ اب ایک قدم آگے بڑھ کر غور کیجیے تو یہ حقیقت بھی آپ پر واضح ہوگی کہ اس کے تنوع کے اندر مقصد کی ہم آہنگی اور اس کے تضاد کے اندر توافق کی سازگاری پائی جاتی ہے۔ یہ چیز اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کائنات پر ایک ہی خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کا ارادہ کارفرما ہے۔ کوئی دوسرا اس میں دخیل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات شرک کے ہر شائبہ سے پاک ہے اور اس کی اس پاکی کی شہادت اس کائنات کی ہر چیز دے رہی ہے۔

آخرت کا دلیل

نیز یہ بات بھی واضح ہوئی کہ جب ہر چیز جوڑا جوڑا ہے اور ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر اپنے مقصد کو پورا کرتی ہے تو لازم ہے اس دنیا کا بھی کوئی جوڑا ہو ورنہ یہ بالکل بے مقصد و بے غایت ہو کے رہ جاتی ہے اور یہ بات ایک حکیم خالق کی شان سے بعید ہے کہ وہ کوئی عبث اور بے مقصد کام کرے۔ چنانچہ اس دنیا کے اس خلا کو بھرنے کے لیے اس نے آخرت بنائی ہے۔

آیت کا مدعا یہ ہوا کہ یہ کائنات اپنے وجود سے توحید اور آخرت کی شہادت دے رہی ہے اور اس کا خالق اس بات سے پاک ہے کہ اس کا کوئی شریک ہو یا اس نے یہ دنیا بالکل بے مقصد بنائی ہو۔ لفظ سُبْحٰنَ تنزیہہ کے لیے آتا ہے۔ یہاں اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۚ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ (۳۷)

شب اور روز کی نشانی

فرمایا کہ اگر یہ لوگ غور کریں تو ان کے لیے رات بھی خدا کی قدرت، حکمت، ربوبیت اور توحید کی ایک بہت بڑی نشانی ہے۔ ہم اس کے اوپر ایک نور کی چادر اوڑھا دیتے ہیں تو ان کے لیے روشن دن نمودار ہو جاتا ہے جس میں وہ اپنے کام کاج انجام دیتے ہیں۔ پھر ہم اپنی یہ نورانی چادر اس سے کھینچ لیتے ہیں تو وہ تاریکی میں ہو جاتے ہیں جس میں وہ آرام کرتے ہیں۔ اگر ہم اپنی یہ نورانی چادر نہ اوڑھائیں تو ہمیشہ تاریکی ہی میں رہیں اور اگر اس چادر کو نہ کھینچیں تو ان کو کبھی شب کا سکون نہ میسر ہو۔ روز و شب کا یہ ایاب و ذہاب اور خلق کے مفاد کے لیے ان کی یہ سازگاری اس بات کی صاف دلیل ہے کہ یہ دنیا اضداد کی کوئی رزم گاہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک خالق کی بنائی ہوئی دنیا ہے جو اس کے تمام اضداد کو اس کے مجموعی مفاد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (۳۸)

سورج کی نشانی

یہ دن کے اندر ظاہر ہونے والی سب سے بڑی نشانی کی طرف توجہ دلائی کہ اس سورج کو دیکھیں کہ یہ پوری پابندی کے ساتھ اپنے ایک معین محور و مدار پر گردش کرتا ہے۔ مجال نہیں کہ اپنے محور و مدار سے ذرا ہٹ سکے یا اس کی پابندی اوقات میں منٹ یا سکینڈ کا بھی فرق پیدا ہو سکے۔ کیا یہ اس بات کی شہادت ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے آپ سے آپ ہو رہا ہے، اس کے پیچھے کوئی مدبر

اور کارفرما طاقت نہیں ہے؟ یا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے پیچھے ایک قاہر و مقتدر اور علیم و حکیم ہستی ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی باگ ہے اور وہ اپنے بنائے ہوئے نقشہ اور اپنے قرار دادہ منصوبہ کے مطابق ہر چیز کو استعمال کر رہی ہے؟ اس کا صحیح جواب، عقل و فطرت کے مطابق، صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ یعنی یہ دنیا نہ تو اتفاق سے وجود میں آئی ہوئی کوئی چیز ہے اور نہ یہ آپ سے آپ چل رہی ہے بلکہ یہ ایک ایسی ہستی کی پلاننگ کا کرشمہ ہے جو ہر چیز پر قادر و غالب اور ہر چیز کا علم رکھنے والی ہے۔

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ (۳۹)

چاند کی نشانی

فرمایا کہ یہی حال اس دنیا کی دوسری سب سے بڑی نشانی ——— چاند ——— کا ہے۔ وہ بھی نہ خود کار ہے، نہ خود مختار، بلکہ ہم نے اس کے لیے منزلیں ٹھہرا رکھی ہیں جو ہر ماہ اس کو طے کرنی پڑتی ہیں یہاں تک کہ منزلیں طے کرتے کرتے وہ بالآخر کھجور کی پرانی ٹہنی کے مانند ہو کے رہ جاتا ہے۔

عُرْجُوْن کھجور کی اس ٹہنی کو کہتے ہیں جس میں خوشے لگتے ہیں۔ یہ ٹہنیاں خشک ہونے کے بعد خمدار ہو کر بالکل وہ شکل اختیار کر لیتی ہیں جو شکل آخری اور ابتدائی تاریخوں میں چاند کی ہوتی ہے۔ یہ تشبیہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ جس چاند کو نادان لوگ پوجتے ہیں اس غریب کی بےبسی کا یہ حال ہے کہ ہر ماہ اس کو مختلف منازل فلکی طے کرنی پڑتی ہیں جس سے وہ سوکھ کے کانٹا اور اس طرح خمیدہ کمر ہو کے رہ جاتا ہے جس طرح کھجور کی سوکھی ٹہنی۔

لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (۴۰)

ساری کائنات ایک ہی خدا کے ہاتھ میں ہے

یعنی اس کائنات کا سارا نظام اس کے خالق نے اس طرح اپنے قابو میں کر رکھا ہے کہ نہ سورج کی مجال ہے کہ وہ اپنے مدار سے نکل کر چاند کے مدار میں جا گھسے اور اس کو پکڑ لے اور نہ رات کی مجال ہے کہ ایک سیکنڈ کے لیے بھی دن پر سبقت کر جائے بلکہ ان میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے دائرے میں گردش کرنی پڑتی ہے ——— یہ اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز کی باگ ایک ہی خدائے قدیر و علیم کے ہاتھ میں ہے اور وہی تنہا ہر چیز کا مالک و مختار ہے۔ اگر اس کے سوا کسی اور کا بھی اس میں کوئی دخل ہوتا تو یہ دنیا اپنے اضداد کے تصادم میں تباہ ہو جاتی۔ خاص طور پر یہ حقیقت تو بالکل نمایاں ہے کہ جو چیزیں جتنی ہی زیادہ نمایاں ہیں اور جن کے نمایاں ہونے ہی کی بنا پر قوموں نے ان کو معبود مان کر ان کی پرستش کی وہ اپنے وجود ہی سے یہ اعلان کر رہی ہیں کہ وہ سب سے زیادہ مسخر و محکوم ہیں، مجال نہیں ہے کہ وہ اپنے دائرۂ کار سے ایک انچ بھی اِدھر یا اُدھر سرک سکیں۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۙ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ

یَرْکَبُوْنَ ○ وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِیْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ یُنْقَذُوْنَ ۙ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰی حِیْنٍ (۴۱-۴۴)

کشتی کا نشانی

'ذُرِّیَّتَهُمْ' میں 'هُمْ' سے مراد مخاطب بحیثیت انسان ہیں اور 'ذُرِّیَّة' نسل کے مفہوم میں ہے۔ 'مَشْحُوْن' بھری ہوئی کشتی کو کہتے ہیں۔ فرمایا کہ اگر ان کو مزید نشانی کی طلب ہو تو وہ اس بات کو دیکھیں کہ ہم نے نسل انسانی کے بحری سفر کے لیے یہ اہتمام کیا ہے کہ ان کی کشتیاں سمندر کے سینہ پر سے ہزاروں ٹن سامان لے کر چلتی ہیں اور نہیں ڈوبتیں۔

خشکی کے سفینے

'وَخَلَقْنَا لَهُمْ الاٰیة' فرمایا کہ جس طرح سمندر کے سفر کے لیے ہم نے کشتی بنائی ہے اسی طرح کی چیزیں ہم نے خشکی کے سفر کے لیے بھی بنائی ہیں مثلاً گھوڑے اور اونٹ وغیرہ۔ خاص طور پر اونٹ کو عرب میں سفینۂ صحرا کی حیثیت حاصل تھی۔ اسی حکم میں وہ سواریاں بھی داخل ہیں جو اب سائنس کی مدد سے ایجاد ہوئی ہیں یعنی موٹریں، لاریاں، بسیں، ہوائی جہاز وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں جن قوانین کے تحت کام کرتی ہیں وہ خدا ہی کے بنائے اور اسی کے سکھائے ہوئے ہیں۔ انسان انہی قوانین سے کام لے کر مختلف چیزیں ایجاد کرتا اور ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف منسوب فرمایا اس لیے کہ اصل حقیقت یہی ہے۔

ہر چیز اللہ کے فضل کا کرشمہ ہے

'وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِیْخَ لَهُمْ الاٰیة'۔ 'صَرِیْخ' فریاد اور فریادرسی کے معنی میں بھی آتا ہے اور فریاد کرنے اور فریادرسی کرنے والے کے معنی میں بھی۔ یہاں یہ تمام معانی کے اعتبار سے موزوں ہے۔ فرمایا کہ یہ ہماری رحمت ہے کہ ان کی لدی پھندی کشتیاں سمندر کے سینہ پر دوڑتی ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو ان کو کشتی سمیت غرق کر دیں پھر نہ وہ کوئی فریاد کر سکیں اور نہ کوئی ان کی فریادرسی کر سکے اور نہ وہ اس ورطۂ ہلاکت سے کسی طرح نجات پا سکیں۔

'اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰی حِیْنٍ' فرمایا کہ انسان کو یہ جو کچھ بھی حاصل ہے نہ اس کے اب وجد کی میراث ہے اور نہ اس کی اپنی قوت و قابلیت کا کرشمہ بلکہ یہ محض خدا کا فضل اور اس کی رحمت ہے جس سے ایک وقتِ خاص تک کے لیے اس نے اس کو بہرہ مند کیا ہے۔ بالآخر وہ وقت آنے والا ہے جب اللہ تعالیٰ ان تمام نعمتوں سے متعلق پرسش کرے گا کہ ان کا شکر اور حق ادا کیا گیا یا نہیں!

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَیْنَ اَیْدِیْکُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۴۵)

ناشکروں کو تنبیہ!

یعنی جب ان کو تنبیہ کیا جاتا ہے کہ تمہارے آگے اور پیچھے جو آسمان و زمین ہیں ان سے ڈرو کہ زمین تمہارے سمیت دھنسا نہ دی جائے اور آسمان سے تم پر ٹکڑے نہ گرا دیے جائیں تو وہ متنبہ ہونے کے بجائے اعراض کرتے اور عذاب کی نشانی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ 'اِذَا' کا جواب یہاں بربنائے وضاحت قرینہ محذوف ہے اور 'مَا بَیْنَ اَیْدِیْکُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ' کے بعد 'مِنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ' کے الفاظ محذوف ہیں۔ سورۂ

سبا میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے۔ اَفَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَیْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ (۹) (کیا وہ اپنے آگے اور پیچھے کے آسمان اور زمین پر غور نہیں کرتے! اگر ہم چاہیں تو ان کے سمیت زمین کو دھنسا دیں یا ان کے اوپر آسمان سے ٹکڑے گرا دیں)۔

وَمَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ (۴۶)

یعنی یہ اعراض و انکار اس طرح ان پر مستولی ہو گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو آیت بھی ان کی تعلیم و تذکیر کے لیے آتی ہے وہ بالکل بے سود ہو کے رہ گئی ہے۔ کوئی چیز بھی ان کے اوپر کارگر نہیں ہوتی۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۴۷)

**ایک جاہلی فلسفہ**

اوپر والی آیت میں ان کی جس بے حسی اور سنگدلی کی طرف اشارہ ہے یہ اس کی ایک مثال بیان ہوئی ہے کہ جب ان کو شکر کی دعوت دی جاتی ہے، جیسا کہ اوپر آیت ۳۵ میں ہے۔ لِیَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ وَمَا عَمِلَتْهُ اَیْدِیْهِمْ اَفَلَا یَشْكُرُوْنَ تو یہ رعونت کے ساتھ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ چنانچہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو رزق و فضل تم کو بخشا ہے اس کا حق یہ ہے کہ اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور ان غریبوں کی مدد کرو جو مدد کے محتاج ہیں تو وہ مسلمانوں کو یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ تمہاری صریح گمراہی ہے کہ جن کو اللہ نے محروم رکھنا چاہا ہے ان کو تم کھلانا چاہتے ہو۔ اگر اللہ ان کو بھی ہماری طرح کھلانا پہنانا چاہتا تو آخر اس کے پاس کس چیز کی کمی تھی! لیکن جب اس نے ایسا نہیں کیا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس نے ان کے لیے یہی چاہا ہے اور جب اس نے ان کے لیے یہی چاہا ہے تو ہم ان کے اوپر کوئی احسان کر کے خدا کو خوش نہیں کریں گے بلکہ اس کی ناراضگی مول لیں گے! ـــــ اس فلسفۂ جاہلی کا حوالہ دے کر اس پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس لیے کہ اس کی قساوت و سفاہت اس قدر واضح ہے کہ اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں تھی۔ مقصود بس یہ دکھانا ہے کہ جب دل بگڑتے ہیں اور عقل الٹتی ہے تو آدمی کا حال یہ ہو جاتا ہے!

وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ مَا یَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَیْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ یَخِصِّمُوْنَ ۝ فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ تَوْصِیَةً وَّلَاۤ اِلٰۤی اَهْلِهِمْ یَرْجِعُوْنَ (۴۸-۵۰)

یعنی اللہ کی جو آیتیں ان کو سنائی جاتی ہیں ان پر تو وہ کوئی دھیان نہیں کرتے، بس یہ مطالبہ ان کی طرف سے پیہم ہے کہ جس عذاب سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے وہ ان کو دکھا دیا جائے۔ اس کے بغیر وہ اس کی خبر دینے والوں کو سچا ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

مَا یَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَیْحَةً وَّاحِدَةً الآیۃ۔ لفظ 'صَیْحَةً' آیت ۲۹ میں گزر چکا ہے۔ فرمایا کہ اس

طنطنہ کے ساتھ وہ اس عذاب کا جو مطالبہ کر رہے ہیں تو کس برتے پر کر رہے ہیں! خدا کو اس کے لیے کوئی سرو سامان نہیں کرنا ہے۔ اس کی تو بس ایک ڈانٹ ہی ان کے لیے کافی ہوگی۔ وہ ان بحثوں ہی میں پڑے ہوں گے کہ وہ ان کو دبوچ لے گی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ نہیں آ رہا ہے تو اس کے نہ آنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کی تیاری نہیں ہو پائی ہے۔ اس کی تیاری میں کوئی کسر نہیں ہے۔ بس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے سبب سے لوگوں کو مہلت دے رہا ہے۔

'فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ تَوْصِیَۃً الاٰیۃ' یعنی خدا کی وہ ایک ہی ڈانٹ ایسی ہوگی کہ جو جہاں ہے وہ وہیں دبوچ لیا جائے گا۔ اس کو اتنی فرصت بھی نصیب نہیں ہوگی کہ کسی کو کوئی وصیت کر سکے یا اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ سکے۔

## ۶۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۵۱-۶۸

آگے واضح فرمایا ہے کہ جس طرح اس دنیا میں کوئی عذاب لانے کے لیے ہماری ایک ہی ڈانٹ کافی ہے اسی طرح جب ہم قیامت لانی چاہیں گے تو اس کے لیے بھی ہمیں کوئی خاص اہتمام نہیں کرنا ہوگا بلکہ ایک ہی نفخِ صور میں سب اٹھ کھڑے ہوں گے۔

اس کے بعد روزِ قیامت کی تصویر ہے کہ اہلِ ایمان اس دن اپنی دلچسپیوں میں مگن ہوں گے اور کفار اپنے نتائجِ اعمال سے دوچار ہوں گے۔ اس دن کسی کو زبان سے کچھ بولنے کی اجازت نہیں ہوگی بلکہ ہر شخص کے ہاتھ پاؤں خود اس کے خلاف گواہی دیں گے۔

پھر دھمکی دی ہے کہ یہ لوگ اس ڈھٹائی کے ساتھ جو عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں تو یاد رکھیں کہ یہ ہمارے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ ہم چاہیں تو ان کو ان کی جگہ ہی پر اس طرح مسخ کر دیں کہ یہ تمام قوتوں اور صلاحیتوں سے چشم زدن میں بالکل محروم ہو کے رہ جائیں۔ اس کے آثار وہ اس دنیا میں دیکھ سکتے ہیں بشرطیکہ ان کے پاس آنکھیں ہوں۔ اگر ہم نے ان کو مسخ نہیں کیا تو اس وجہ سے نہیں کہ یہ کام ہمارے لیے مشکل ہے بلکہ یہ ہماری رحمت ہے کہ ہم لوگوں کو ان کی سرکشی کے باوجود مہلت دیتے ہیں۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے:

آیات ۵۱-۶۸

وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰی رَبِّهِمْ یَنْسِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ قَالُوْا یٰوَیْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ٜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۲﴾ اِنْ کَانَتْ اِلَّا صَیْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ

جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ ﴿۵۳﴾ فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا
تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۵۴﴾ إِنَّ أَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي
شُغُلٍ فٰكِهُونَ ﴿۵۵﴾ هُمْ وَأَزْوٰجُهُمْ فِي ظِلٰلٍ عَلَى الْأَرَآئِكِ
مُتَّكِـُٔونَ ﴿۵۶﴾ لَهُمْ فِيهَا فٰكِهَةٌ وَلَهُم مَّا يَدَّعُونَ ﴿۵۷﴾ سَلٰمٌ
قَوْلًا مِّن رَّبٍّ رَّحِيمٍ ﴿۵۸﴾ وَامْتٰزُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ ﴿۵۹﴾
أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يٰبَنِيٓ ءَادَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ
عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿۶۰﴾ وَأَنِ اعْبُدُونِي ۚ هٰذَا صِرٰطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿۶۱﴾ وقف غفران
وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا ۖ أَفَلَمْ تَكُونُوا تَعْقِلُونَ ﴿۶۲﴾
هٰذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ﴿۶۳﴾ اصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنتُمْ
تَكْفُرُونَ ﴿۶۴﴾ الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰٓ أَفْوٰهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ أَيْدِيهِمْ
وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۶۵﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا
عَلَىٰٓ أَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرٰطَ فَأَنّٰى يُبْصِرُونَ ﴿۶۶﴾ وَلَوْ نَشَآءُ
لَمَسَخْنٰهُمْ عَلَىٰ مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطٰعُوا مُضِيًّا وَلَا يَرْجِعُونَ ﴿۶۷﴾ ع ۴ ۱۷
وَمَن نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۖ أَفَلَا يَعْقِلُونَ ﴿۶۸﴾

ترجمہ آیات ۵۱-۶۸

اور صُور پھونکا جائے گا تو وہ دفعتہً قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف چل پڑیں گے
وہ کہیں گے، ہائے ہماری بدبختی! ہم کو ہماری قبر سے کس نے اٹھا کھڑا کیا! — یہ تو وہی
چیز ہے جس کا خدائے رحمان نے وعدہ کیا تھا اور پیغمبروں کی بات سچی نکلی! بس وہ ایک ڈانٹ
ہوگی، بس وہ دفعتہً سب کے سب ہمارے حضور حاضر کر دیے جائیں گے۔ ۵۱-۵۳

پس آج کے دن کسی جان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ اور تم کو بس وہی بدلے میں ملے گا جو تم کرتے رہے ہو۔ بے شک اہلِ جنت آج اپنی دلچسپیوں میں مگن ہوں گے۔ وہ اور ان کی بیویاں، سایوں میں تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے بیٹھیں گے۔ اور اس میں ان کے لیے میوے ہوں گے اور ان کے لیے وہ سب کچھ ہوگا جو وہ مانگیں گے۔ ان کو سلام کہلایا جائے گا پروردگارِ رحیم کی طرف سے! ۵۴-۵۸

اور اے مجرمو! آج الگ ہو جاؤ۔ اور اے آدم کے بیٹو! کیا میں نے تمھیں یہ ہدایت نہیں کر دی تھی کہ شیطان کی بندگی نہ کیجیو، بے شک وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ اور یہ کہ میری ہی بندگی کیجیو۔ یہی سیدھی راہ ہے۔ اور اس نے تم میں سے ایک خلقِ کثیر کو گمراہ کر لیا، تو کیا تم سمجھتے نہیں تھے! یہ ہے وہ جہنّم جس سے تم کو ڈرایا جاتا رہا ہے۔ اب اپنے کفر کی پاداش میں اس میں داخل ہو جاؤ۔ ۵۹-۶۴

آج ہم ان کے مونہوں پر مہر کر دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم کو بتائیں گے اور ان کے پاؤں شہادت دیں گے جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔ ۶۵

اور اگر ہم چاہتے تو ان کی آنکھیں مٹا دیتے پھر وہ راستہ کی طرف بڑھتے تو کس طرح دیکھ پاتے! اور اگر ہم چاہتے تو ان کی جگہ ہی پر ان کو مسخ کر دیتے تو نہ وہ آگے بڑھ سکتے اور نہ پیچھے لوٹ سکتے۔ اور جس کو ہم زیادہ عمر دیتے ہیں ہم اس کو اس کی خلقت میں پیچھے لوٹا دیتے ہیں تو کیا وہ سمجھتے نہیں؟ ۶۶-۶۸

---

## ۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُمْ مِنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنْسِلُونَ (۵۱)

تاخیرِ عذاب کی حکمت

اوپر کی آیات ۴۸ - ۴۹ میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ رسول کی تکذیب کی صورت میں جس عذاب کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے اگر وہ ٹل رہا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے لیے کوئی خاص تیاری کرنی ہے جو ابھی نہیں ہو پائی ہے۔ وہ عذاب بھیجنا چاہے تو اس کے لیے بس اس کی ایک ہی ڈانٹ کافی ہے۔ اب یہ فرمایا کہ یہی حال قیامت کا بھی ہے۔ اس کے لانے کے لیے بھی خدا کو کوئی خاص اہتمام و انتظام نہیں کرنا پڑے گا، بلکہ جوں ہی صور پھونکا جائے گا لوگ بھاگتے ہوئے اپنے رب کی طرف چل پڑیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ رسول کو زچ کرنے کے لیے عذاب یا قیامت کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ یاد رکھیں کہ ان کاموں میں سے کوئی کام بھی اللہ کے لیے ذرا مشکل نہیں ہے۔ یہ تو چشم زدن میں ہو جانے والے کام ہیں۔ اگر اس کے باوجود نہیں ہو رہے ہیں تو اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر توبہ اور اصلاح کر لیں۔

قَالُوْا یٰوَیْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ (۵۲)

مذاق اڑانے والوں کا حال قیامِ قیامت کے وقت

یعنی یہ مذاق اڑانے والے لوگ اس وقت گھبراہٹ اور سراسیمگی میں اپنے سر پیٹیں گے اور کہیں گے کہ یہ کس نے ہم کو ہماری قبروں سے اٹھا کھڑا کیا! یہ سوال تحقیق کے لیے نہیں بلکہ اپنی بدبختی کے اظہار کے لیے وہ کریں گے کہ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ مرنے کے بعد اٹھنا نہیں ہوگا لیکن یہ تو واقعہ ثابت ہوا۔

'هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ'۔ یہ ان کے قول کا حصہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تو وہی بات ہوئی جس کی خدائے رحمان کی طرف سے ہم کو آگاہی دی گئی تھی، رسولوں کی بات بالکل سچی نکلی۔ اور اس کا بھی امکان ہے کہ یہ بات فرشتوں کی زبانی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس وقت ان کی تذلیل کے لیے فرمائی جائے کہ اب اپنی بدبختی پر سر پیٹو، یہ وہی چیز تمھارے سامنے آئی ہے جس سے خدائے رحمان نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے تم کو آگاہ کر دیا تھا لیکن تم نے ان کی کوئی پروا نہیں کی۔ میرا رجحان اس دوسری بات کی طرف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے نظائر سے واضح تائید اسی کی نکلتی ہے۔ سورۂ صافات میں ہے:

| | |
|---|---|
| فَاِنَّمَا هِیَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ یَنْظُرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا یٰوَیْلَنَا هٰذَا یَوْمُ الدِّیْنِ ۝ هٰذَا یَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (۱۹-۲۱) | بس وہ ایک ڈانٹ ہی ہوگی کہ دفعتہً وہ اٹھ کے تاکنے لگیں گے اور کہیں گے۔ ہائے ہماری بدبختی! یہ تو جزا و سزا کا دن آگیا ——— یہ وہی فیصلہ کا دن ہے جس کو تم جھٹلاتے تھے |

اس میں آخری فقرہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو بالکل بروقت ان کی تفضیح کے لیے کہلایا جائے گا۔

اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَیْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِیْعٌ لَّدَیْنَا مُحْضَرُوْنَ (۵۳)

یہ سب کچھ بالکل چشم زدن میں، محض ہماری ایک ڈانٹ سے ہو جائے گا۔ اس کے لیے نہ ہمیں دم دمے

بنانے پڑیں گے، نہ توپیں نصب کرنی پڑیں گی۔ جس طرح ہم اپنے کلمۂ 'کُن' سے جو چیز چاہیں وجود میں لا سکتے ہیں اسی طرح اپنی ایک ڈانٹ سے جو قیامت برپا کرنی چاہیں برپا کر سکتے ہیں۔ 'جمیع' تاکید کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ پھر کوئی ہم سے بچ کے نکل سکے گا۔ اس کے بعد ان کے سب چھوٹے اور بڑے، امیر اور مامور، عابد اور معبود پکڑ کر ہمارے حضور حاضر کر دیے جائیں گے۔ 'مُحْضَرُوْنَ' ان کی ذلت کی تصویر کے لیے ہے کہ وہ اس طرح ہمارے سامنے حاضر کیے جائیں گے جس طرح مجرم عدالت کے سامنے حاضر کیے جاتے ہیں۔

فَالْیَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْئًا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۵۴)

ہر ایک کے سامنے اس کا اپنا ہی عمل آئے گا

اس آیت میں تصویرِ حال کا اسلوب ہے۔ گویا وہ دن سامنے ہے اور مخاطب سے یہ بات کہی جا رہی ہے۔ قرآن میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔

فرمایا کہ آج عدلِ کامل کے ظہور کا دن ہے۔ آج کسی جان پر ذرہ برابر ظلم نہیں ہوگا۔ 'وَلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ' یہ اسی عدلِ کامل کا بیان ہے کہ آج جس اصول پر لوگوں کے ساتھ معاملہ ہوگا وہ یہ ہے کہ جس نے جو کچھ کیا ہوگا وہی وہ بدلے میں پائے گا۔ ظاہر ہے کہ جب اپنی ہی کمائی سامنے آنے والی ہے تو اس میں کسی ظلم یا ناانصافی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْیَوْمَ فِیْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ۚ هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِیْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ ۚ لَهُمْ فِیْهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا یَدَّعُوْنَ ۚ سَلٰمٌ ۟ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ (۵۵-۵۸)

اہلِ جنت کی تصویر

اس دن اہلِ جنت کا جو حال ہوگا یہ اس کی تصویر ہے۔ فرمایا کہ اس دن اہلِ جنت اپنی خاص دلچسپی میں مگن ہوں گے۔ 'شُغُلٍ' کی تنکیر تفخیمِ شان کے لیے ہے۔

'هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ الاٰیۃ' یہ ان کی بیویوں کا ذکر آیا ہے کہ وہ بھی ان کی دلچسپیوں میں شریک ہوں گی۔ ان کا ذکر خاص اہتمام سے اس لیے ضروری ہوا کہ آدمی کی کوئی دلچسپی اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک اس کے اہل و عیال بھی اس میں شریک نہ ہوں۔ 'عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ' یہ سب سے اعلیٰ نشست کی تصویر ہے۔ اس زمانے میں بادشاہ اور ملکہ مزین تختوں ہی پر ٹیک لگا کر بیٹھتے تھے۔ اہلِ جنت اپنی ابدی بادشاہی میں اسی طرح بیٹھیں گے۔

'لَهُمْ فِیْهَا فَاكِهَةٌ الاٰیۃ' اس میں ان کے آگے پھل پیش کیے جائیں گے اور مزید جو کچھ وہ طلب کریں گے 'مَا یَدَّعُوْنَ' یعنی 'مَا یَشْتَهُوْنَ' جو کچھ وہ چاہیں گے وہ سب ان کے لیے حاضر ہوگا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اس دنیا میں کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی نہ اب تک یہ درجہ حاصل ہو سکا ہے اور نہ آئندہ کبھی حاصل ہو سکے گا کہ وہ جو کچھ چاہے اس کے لیے وہ فوراً حاضر کر دیا جائے۔ لیکن اہلِ جنت کو جنت میں یہ درجہ حاصل ہوگا اور ہمیشہ حاصل ہوگا۔

سب سے بڑی سرفرازی

'سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ' یہ اس سب سے بڑی سرفرازی کا ذکر ہے جو اہلِ جنت کو جنت میں حاصل ہوگی کہ ربِ رحیم کی طرف سے ان کو سلام کہلایا جائے گا۔ میرے نزدیک جملہ کی تالیف یوں ہے۔ 'تَحِیَّتُھُمْ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ' مبتدا یہاں حذف کر دیا گیا ہے تاکہ مخاطب کی ساری توجہ خبر پر مرکوز ہو جائے۔ سورۂ احزاب میں ارشاد فرمایا ہے۔ 'تَحِیَّتُھُمْ یَوْمَ یَلْقَوْنَہٗ سَلٰمٌ' (۴۴) (اور ان کا خیر مقدم جس دن وہ اس سے ملیں گے سلام سے ہوگا) احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے جنت کے تمام دروازوں سے داخل ہوں گے اور اہلِ جنت کو اللہ تعالیٰ کا سلام پہنچائیں گے —— کون اندازہ کر سکتا ہے اہلِ جنت کی اس سرفرازی کا کہ ان کو ربِ رحیم و کریم کی طرف سے سلام و پیغام موصول ہوں گے!!

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست!

وَامْتَازُوا الْیَوْمَ اَیُّھَا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ اَلَمْ اَعْھَدْ اِلَیْکُمْ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ ۚ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۝ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِیْ ۚ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ۝ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْکُمْ جِبِلًّا کَثِیْرًا ۭ اَفَلَمْ تَکُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ (۵۹-۶۲)

مجرموں کا حشر

اہلِ جنت کا حال بیان کرنے کے بعد اب یہ مجرموں کا حشر بیان ہو رہا ہے۔ ان کو حکم ہوگا کہ اے مجرمو! دنیا میں تو تم میرے باایمان بندوں کے ساتھ رلے ملے رہے اس لیے کہ دنیا دارالامتحان تھی لیکن اب جزائے اعمال کا دن آگیا۔ اس وجہ سے اب تم میرے باایمان بندوں سے الگ ہو جاؤ اور اپنے اعمال کی سزا بھگتو۔ اب تمھاری دنیا الگ اور ان کی دنیا الگ ہے۔

'اَلَمْ اَعْھَدْ اِلَیْکُمْ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ الآیۃ' ۔ 'عَھِدَ' کا صلہ جب 'اِلٰی' کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ضامن اور ذمہ دار بنانے کے ہوتے ہیں۔ مثلاً 'وَعَھِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَھِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ' (البقرۃ: ۱۲۵) (اور ہم نے ابراہیم و اسماعیل کو اس بات کا ذمہ دار بنایا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھنا) یہ مجرموں کو اس وقت بطور ملامت یاد دہانی کی جائے گی کہ آدم کے بیٹو! کیا میں نے تم کو اس عہد کا پابند نہیں کیا تھا کہ شیطان کی بندگی نہ کرنا، وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے بلکہ صرف میری ہی بندگی کرنا۔ یہ نہایت سیدھی راہ ہے جس پر چلنے والے مجھ تک پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن تم ایسے بد قسمت نکلے کہ اس نے تمھارے اندر سے ایک خلقِ کثیر کو گمراہ کر ڈالا، کیا تم اتنی عقل و تمیز نہیں رکھتے تھے کہ اپنے دوست اور دشمن میں امتیاز کر سکتے؟ اور اس بات کو یاد رکھتے کہ اس نے اپنے فریب سے تمھارے باپ آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلوایا اور اولادِ آدم کے ساتھ اس کی دشمنی قیامت تک کے لیے ہے۔

شیطان کی دشمنی، شیطان کے چیلنج، اولادِ آدم کو اللہ تعالیٰ کی یاد دہانی اور اس سلسلہ کے دوسرے امور جن کی طرف یہاں اشارہ ہے پچھلی سورتوں، خاص طور پر بقرہ اور اعراف میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکے ہیں۔ ان اجمالات کو ان کی روشنی میں سمجھیے۔

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ ۝ اِصۡلَوۡهَا الۡیَوۡمَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَکۡفُرُوۡنَ (۶۳-۶۴)

یعنی اگر تم نے میرے عہد اور میری تنبیہ کو یاد نہیں رکھا تو اس کا انجام اب اس جہنم کی صورت میں تمہارے سامنے ہے۔ اس سے میرے رسول اور میرے نیک بندے تم کو ڈراتے رہے لیکن تم برابر ان کی باتوں کا انکار کرتے رہے۔ اب اس میں داخل ہو، یہی تمہارا ٹھکانا ہے۔

اَلۡیَوۡمَ نَخۡتِمُ عَلٰۤی اَفۡوَاهِهِمۡ وَ تُکَلِّمُنَاۤ اَیۡدِیۡهِمۡ وَ تَشۡهَدُ اَرۡجُلُهُمۡ بِمَا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ (۶۵)

ہاتھ پاؤں کی گواہی

اوپر کی آیات میں اسلوبِ کلام خطاب کا تھا، اس آیت میں غائب کا ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اوپر کی آیات میں زجر و ملامت ہے جس کے لیے موزوں اسلوب خطاب ہی کا ہے اور اس آیت میں ان کی بے بسی کی تصویر ہے جس کے لیے غائب کا اسلوب زیادہ موزوں ہے۔ فرمایا کہ آج کے دن ہم ان کے مونھوں پر مہر کر دیں گے اور ان کے ہاتھ اور پاؤں کو ناطق بنا دیں گے جو ان کی ساری کارستانیوں کی سرگزشت ہم کو سنا دیں گے۔ مونھوں پر مہر کر دینے کی وجہ یہ ہو گی کہ زبان جھوٹ بھی بول سکتی ہے اور عذر بھی تراش سکتی ہے لیکن ہاتھ پاؤں وہی بیان کریں گے جو انھوں نے کیا ہو گا۔ اس طرح انسان پر خود اس کے اعضاء و جوارح حجت قائم کر دیں گے اور یہ حجت تمام حجتوں پر بھاری ہو گی — یہ مضمون سورۂ رحمان میں بھی ہے — فَیَوۡمَئِذٍ لَّا یُسۡـَٔلُ عَنۡ ذَنۡۢبِهٖۤ اِنۡسٌ وَّ لَا جَآنٌّ ۝ ........ یُعۡرَفُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ بِسِیۡمٰهُمۡ فَیُؤۡخَذُ بِالنَّوَاصِیۡ وَ الۡاَقۡدَامِ ۝ (الرحمٰن: ۳۹، ۴۱)

(پس اس دن کسی انسان اور جن سے اس کے گناہ کے بابت پرسش کی نوبت نہیں آئے گی ..... مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچان لیے جائیں گے پس ان کی چوٹیاں اور ان کی ٹانگیں پکڑ کے جہنم میں پھینک دیا جائے گا)۔

وَ لَوۡ نَشَآءُ لَطَمَسۡنَا عَلٰۤی اَعۡیُنِهِمۡ فَاسۡتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰی یُبۡصِرُوۡنَ (۶۶)

تنبیہ و تہدید

یعنی جب ان کا حال یہ ہے کہ اپنی ان صلاحیتوں سے جو اللہ نے ان کو بخشی ہیں کوئی کام ہی نہیں لے رہے ہیں تو یہ مستحق ہیں کہ ہم ان سے ان کو محروم کر دیں اور یہ کام ہمارے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ ہم چاہتے تو ان کی آنکھیں مٹا دیتے، پھر یہ راستہ کی تلاش میں بھٹکتے پھرتے لیکن ان کو راہ نہ ملتی۔ لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا تو یہ ہماری رحمت ہے اور اب بھی ان کے لیے موقع ہے کہ یہ ہماری اس رحمت سے فائدہ اٹھائیں اور آنکھیں بند کر کے زندگی نہ گزاریں — 'لَوۡ' شرط فی الماضی کے لیے آتا ہے اور ہمارے نزدیک یہاں مضارع سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے۔ یعنی 'وَلَوۡ کُنَّا نَشَآءُ'۔

وَ لَوۡ نَشَآءُ لَمَسَخۡنٰهُمۡ عَلٰی مَکَانَتِهِمۡ فَمَا اسۡتَطَاعُوۡا مُضِیًّا وَّ لَا یَرۡجِعُوۡنَ (۶۷)

اسی طرح اگر ہم چاہتے تو ان کو ان کی جگہ ہی پر مسخ کر کے رکھ دیتے تو پھر نہ وہ آگے ہی کو بڑھ سکتے اور نہ پیچھے ہی کو پلٹ سکتے لیکن یہ ہماری عنایت ہے کہ ہم نے ایسا نہیں کیا بلکہ ان کو مہلت دیے ہوئے ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو سنبھل جائیں اور خدا کی بخشی ہوئی صلاحیتوں کا حق پہچانیں، ان کی قدر کریں اور اپنے رب

کے شکر گزار بندے نہیں۔

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ؕ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ (۶۸)

انسانی زندگی کے احوال و مشاہدات سے اوپر کے دعوے کی دلیل

اوپر جو دھمکی دی گئی ہے یہ انسانی زندگی کے احوال و مشاہدات سے اس کی دلیل دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے لوگوں کی قوتوں اور صلاحیتوں کو مسخ کر دینا ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ انسان جب وجود میں آتا ہے تو وہ ایک مضغۂ گوشت ہوتا ہے پھر اللہ تعالیٰ درجہ بدرجہ اس کو قوت و توانائی بخشتا ہے یہاں تک کہ وہ جوانی کی تمام قوتوں اور صلاحیتوں سے بھرپور ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے اوپر بڑھاپا طاری ہونا شروع ہوتا ہے اور درجہ بدرجہ وہ اسی ضعف و ناتوانی کی حالت کی طرف لوٹ جاتا ہے جس میں وہ اپنی ولادت کے وقت مبتلا تھا ــــ قرآن نے اس حالت کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔ 'اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً' (الروم: ۵۴) (اللہ ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ناتوانی سے، پھر ناتوانی کے بعد اس نے توانائی بخشی پھر توانائی کے بعد ضعف اور بڑھاپا طاری کر دیا) یہ عام حالت کی تصویر ہے۔ ہر شخص جو جوانی اور پیری کے مراحل سے گزرتا ہے اس کو اس کا تجربہ ہوتا ہے۔ قوتوں اور صلاحیتوں کی ناتوانی کا اس سے کہیں زیادہ تجربہ ان لوگوں کو ہوتا ہے جن کو ارذل عمر کے مرحلے سے سابقہ پڑتا ہے۔ قرآن نے ان کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے 'وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا' (النحل: ۷۰) (اور تم میں بعض وہ بھی ہوتے ہیں جو ارذل عمر کو پہنچائے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ جاننے کے بعد کچھ نہیں جانتے)۔

آیت زیر بحث میں اسی صورتِ حال کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس دنیا میں تم دیکھتے ہو کہ جس کی عمر ہم زیادہ کرتے ہیں درجہ بدرجہ اس کی قوتوں اور صلاحیتوں میں ہم اس کو پیچھے کی طرف لوٹا دیتے ہیں۔ یعنی جس ناتوانی کے دور سے وہ زندگی کا آغاز کرتا ہے اسی ناتوانی کی طرف پھر وہ واپس لوٹا دیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام قوتیں اور صلاحیتیں خدا ہی کی بخشی ہوئی ہیں وہ جب چاہے ان کو واپس لے سکتا ہے اور اس طرح واپس لے سکتا ہے کہ کسی کو اپنے دہنے بائیں کا بھی کچھ ہوش باقی نہ رہے تو حیف ہے ان لوگوں پر جو اللہ کی ان نعمتوں کی قدر نہ کریں اور ان کو پا کر خدا کے شکر گزار ہونے کے بجائے استکبار میں مبتلا ہو جائیں۔

'تنکیس' اور 'نکس' کو عام اہلِ لغت بالکل ہم معنی قرار دیتے ہیں۔ یعنی کسی شے کو پیچھے کی طرف لوٹا دینا۔ لیکن میرے نزدیک تنکیس میں تدریج کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے یعنی درجہ بدرجہ کسی چیز کو پیچھے کی طرف لوٹانا۔ قرآن میں یہ دونوں لفظ استعمال ہوئے ہیں اور دونوں جگہ یہ فرق ملحوظ ہے۔ لفظ 'خَلق' یہاں 'خِلقت' کے مفہوم میں ہے اور اس معنی میں یہ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔

## ۸۔ آگے کا مضمون ــ آیات ۶۹-۸۳

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ خاتمہ میں تمہید کے مضمون کو، ایک نئے اسلوب سے پھر لے لیا ہے۔

یاد ہوگا، سورہ کا آغاز قرآن حکیم کی قسم سے ہوا ہے اور اس حکیمانہ کتاب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی دلیل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اس کتاب کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے امیوں پر عظیم احسان فرمایا ہے لیکن اس پر ایمان وہی لائیں گے جن کے اندر زندگی کی رمق ہوگی۔ اس تمہید کے بعد کلام کا رخ قرآن کے دعاوی کے اثبات کی طرف مڑ گیا ہے۔ یہاں بھی غور کیجیے تو وہی بات ایک نئے اسلوب سے آئی ہے۔ پہلے ان مخالفین کی تردید ہے جو قرآن کو شاعری اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر قرار دیتے تھے۔ پھر یہ واضح فرمایا ہے کہ کن لوگوں پر یہ کلام اثر انداز ہوگا اور کون لوگ اس سے محروم رہیں گے۔ اس کے بعد ربوبیت کی بعض واضح آیات کی طرف اشارہ کر کے اس دعوتِ تشکر کا اعادہ کیا ہے جس پر اس سورہ کی بنیاد ہے۔ اس کے بعد کلام کا رخ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کی طرف مڑ گیا ہے کہ لوگ تمہاری مخالفت میں جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا غم نہ کرو، جو لوگ اللہ پر بھی پھبتیاں چست کرنے سے باز نہیں آتے وہ اگر تمہارا مذاق اڑائیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶۹-۸۳

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ ﴿۶۹﴾ لِّیُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَیًّا وَّ یَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ ﴿۷۰﴾ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَاۤ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا یَاْكُلُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَهُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ؕ اَفَلَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَا یَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ﴿۷۶﴾ اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ ﴿۷۷﴾ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِیَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ ﴿۷۸﴾ قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْۤ اَنْشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمُۨ ﴿۷۹﴾ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَاۤ اَنْتُمْ مِّنْهُ

وقف لازم

تُوْقِدُوْنَ ﴿۸۰﴾ اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؕ بَلٰى ۗ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۱﴾ اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۸۲﴾ فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

وقف غفران

ع ۵ ۱۶ ۴

ترجمہ آیات ۶۹-۸۳

اور ہم نے اس کو شعر کی تعلیم نہیں دی ہے اور یہ اس کے شایانِ شان بھی نہیں۔ یہ تو بس یاددہانی اور نہایت واضح قرآن ہے تاکہ وہ ان لوگوں کو آگاہ کر دے جن کے اندر زندگی ہے اور کافروں پر حجت تمام ہو جائے۔ ۶۹-۷۰

کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ ہم نے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے ان کے لیے چوپائے پیدا کیے، پس وہ ان کے مالک ہیں! اور ہم نے ان کو ان کا مطیع بنا دیا، پس ان میں سے بعض پر وہ سوار ہوتے ہیں اور بعض سے وہ غذا حاصل کرتے ہیں اور ان میں ان کے لیے دوسری منفعتیں اور پینے کی چیزیں بھی ہیں۔ تو کیا وہ شکر نہیں کرتے۔ ۷۱-۷۳

اور انھوں نے اس توقع پر اللہ کے سوا دوسرے معبود بنائے ہیں کہ ان کی مدد کی جائے گی۔ وہ ان کی مدد نہیں کر سکیں گے۔ بلکہ وہ ان کی حاضر کی ہوئی فوج بنیں گے۔ تو ان کی بات تم کو مبتلائے غم نہ کرے، ہم جانتے ہیں جو کچھ وہ چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ ۷۴-۷۶

کیا انسان نے غور نہیں کیا کہ ہم نے اس کو پانی کی ایک بوند سے پیدا کیا تو وہ ایک کھلا ہوا حریف بن کر اٹھ کھڑا ہوا! اور اس نے ہم پر ایک پھبتی چست کی اور اپنی پیدائش کو بھول گیا! کہتا ہے کہ بھلا ہڈیوں کو کون زندہ کر سکتا ہے جب کہ وہ بوسیدہ ہو جائیں گی! کہہ دو ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا۔ اور وہ ہر مخلوق سے اچھی طرح باخبر ہے۔

وہی ہے جس نے تمہارے لیے سرسبز درخت سے آگ پیدا کر دی پس تم اس سے آگ جلا لیتے ہو۔ کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا وہ ان کی جیسی مخلوق پیدا کرنے پر قادر نہیں! ہاں وہ قادر ہے اور وہی اصل پیدا کرنے والا اور جاننے والا ہے۔ اس کا معاملہ تو بس یوں ہے کہ جب وہ کسی بات کا ارادہ فرماتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ پس پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۷۷-۸۳

---

## ۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ (۶۹)

شعر و شاعری نبوت کے شایانِ شان نہیں ہے

ضمیر مفعول کا مرجع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ ان لوگوں کے خیال کی تردید ہے جو قرآن کو شاعری اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک شاعر قرار دیتے تھے۔ فرمایا کہ نہ ہم نے اپنے رسول کو شعر کی تعلیم دی، نہ یہ چیز اس کے شایانِ شان ہی ہے۔ یہ ان لوگوں کو جواب دیا گیا ہے جو قرآن کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کو محض اس کے پیش کرنے والے کی شاعرانہ جادو بیانی کا کرشمہ قرار دیتے تھے تاکہ ان کے عوام پر یہ اثر نہ پڑنے پائے کہ وہ اس کی تاثیر و تسخیر سے مرعوب ہو کر اس کو آسمانی کتاب مان لیں۔ عوام کو قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے برگشتہ کرنے کے لیے وہ کہتے تھے کہ قرآن ہے تو بے شک ایک نہایت فصیح و بلیغ کلام لیکن اس کی یہ فصاحت و بلاغت اس وجہ سے نہیں ہے کہ یہ کوئی آسمانی وحی ہے، جیسا کہ اس کا پیش کرنے والا دعویٰ کرتا ہے، بلکہ جس طرح ہمارے اونچے درجے کے شاعروں کے کلام میں تاثیر و تسخیر ہے اسی طرح اس شخص کے کلام میں بھی تاثیر و تسخیر ہے۔ اس وجہ سے اس شخص کو زیادہ سے زیادہ ایک اونچے درجے کا شاعر سمجھنا چاہیے نہ کہ ایک نبی اور رسول اور اس قرآن کو ایک شاعرانہ کلام ہی کا رتبہ دینا چاہیے نہ کہ وحی و الہام کا۔ قرآن نے ان کے اس خیال کی مختلف اسلوبوں سے جگہ جگہ تردید کی ہے۔ خاص طور پر سورۂ شعراء میں اس فرق کو نہایت تفصیل سے نمایاں فرمایا ہے جو ایک نبی اور ایک شاعر کے درمیان ایک عامی کو بھی نظر آ سکتا ہے۔ تفصیل کے طالب اس پر ایک نظر ڈال لیں۔

وَمَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ شاعری نبوت کی شان سے ایک فروتر چیز ہے۔ اس کے فروتر ہونے کے دو پہلو ہیں۔

ایک پہلو تو یہ ہے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی روایات و خصوصیات اور شاعروں کی

روایات و خصوصیات میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ سورۂ شعرآء میں شاعروں کی تین خصوصیات بیان ہوئی ہیں اور یہ تینوں ہی شانِ نبوت کے منافی ہیں۔

ان کی ایک خصوصیت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ صرف گفتار کے غازی ہوتے ہیں، کردار کے غازی نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس نبی اپنی ہر بات پر سب سے اوّل اور سب سے بڑا عمل کرنے والا خود ہوتا ہے۔

دوسری خصوصیت ان کی یہ مذکور ہوئی ہے کہ ان کا کلام متضاد افکار کا مجموعہ ہوتا ہے۔ وہ ہر وادی میں ہرزہ گردی کرتے اور ایک ہی سانس میں کفر و اسلام دونوں کی باتیں کرتے ہیں۔ اس کے بالکل برعکس نبی کی ہر بات اپنی اصل اور فرع دونوں میں بالکل متحد و مربوط اور باہم دگر وابستہ و پیوستہ ہوتی ہے۔

ان کی تیسری خصوصیت یہ بیان ہوئی ہے کہ ان کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں، برعکس اس کے انبیائے کرام کے پیرو ہمیشہ سوسائٹی کے اخیار ہوتے ہیں۔

اگرچہ اس کلیہ میں بعض استثناء بھی ہیں جن کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے لیکن بہت کم۔ عام حالت یہی ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو شعر و شاعری کی چھوت سے محفوظ رکھا۔

انبیاء کی شان سے اس کے فروتر ہونے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ شاعری کا تعلق تمام تر جذبات سے ہے۔ یہ جذبات ہی سے پیدا ہوتی ہے اور جذبات ہی پر عمل کرتی ہے۔ یہ اچھے جذبات ابھارتی ہے اگر اس کے اندر اچھے جذبات ظاہر کیے گئے ہوں اور برے جذبات بھی برانگیختہ کرتی ہے اگر اس کو برے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا جائے۔ اس دائرہ سے باہر اس کا وجود بالکل بے کار ہے۔ حضرات انبیائے کرام جس مشن پر مامور ہوتے ہیں اس کا تعلق صرف جذبات سے نہیں بلکہ انسانی زندگی کے ہر پہلو سے ہوتا ہے اس وجہ سے ان کی اصل اپیل جذبات کے بجائے انسان کی عقل سے ہوتی ہے جو زندگی کے ہر پہلو میں رہنمائی کرتی ہے۔ انھیں لوگوں کو صرف ابھارنا ہی نہیں ہوتا بلکہ ان کی تربیت بھی کرنی ہوتی ہے، ان کی غلطیوں کو درست کرنا ہوتا ہے، ان کو انفرادی و اجتماعی زندگی کے آداب و اصول سکھانے ہوتے ہیں، ان کو حکومت و ریاست کے قوانین و ضوابط بتانے ہوتے ہیں۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھیے کہ انھیں دنیا اور آخرت دونوں کی حسنات سے لوگوں کو بہرہ مند کرنا ہوتا ہے۔ یہ سارے کام ظاہر ہے کہ شاعری کے بس سے باہر ہیں۔ ان کاموں کے لیے ضرورت کسی شاعر کے دیوان یا مجموعۂ کلام کی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کتابِ مبین کی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کو شاعر نہیں بلکہ اپنی کتابِ مبین کا حامل بنایا۔

**ایک سوال کا جواب**

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ جب شاعری حضرات انبیائے کرام کی شان اور ان کے مقصد سے ایک فروتر چیز ہے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو زبور شعر کی شکل میں کیوں عطا فرمائی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس اصل رہنما کتاب زبور نہیں بلکہ تورات تھی۔ زبور کی حیثیت محض تورات کے ایک ضمیمہ کی سمجھیے جس میں حضرت داؤد علیہ السلام کی کچھ دعائیں، مناجاتیں، ان کے مواعظ اور

ان کی پُرحکمت نصیحتیں ہیں۔ تورات کے ساتھ مل کر تو یہ ایک نہایت بابرکت خزانۂ حکمت ہے لیکن تورات کے بغیر یہ اس مقصد کے لیے کافی نہیں ہے جس کے لیے حضرات انبیاء کی بعثت ہوئی۔

قرآن کے ذکر ہونے کے مختلف پہلو

'اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ' یعنی یہ قرآن شعر و شاعری نہیں بلکہ ایک عظیم یاددہانی اور ایک واضح صحیفۂ ہدایت ہے تاکہ یہ خلق کی اصلاح اور لوگوں کی رہنمائی کا ذریعہ بنے۔ قرآن کے 'ذکر' ہونے کا مفہوم اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں۔ یہ ان تمام حقائق کی بھی یاددہانی کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کے اندر ودیعت فرمائے ہیں، اس پوری تاریخ ہدایت کی بھی یاددہانی کرتا ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پھیلی ہوئی ہے اور ان تمام نتائج و عواقب کی بھی یاددہانی کرتا ہے جو دنیا اور آخرت، دونوں میں لازماً پیش آ کے رہیں گے اگر اللہ کے رسول کی تکذیب کی گئی۔

'قُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ' یعنی ایک جامع صحیفۂ ہدایت جو زندگی کے ہر پہلو کے لیے اپنے اندر نہایت واضح، ٹھوس، محکم اور مدلل رہنمائی رکھتا ہے اور ہر حقیقت کو اس طرح کھول کر بیان کرتا ہے کہ کسی انصاف پسند کے لیے کسی شبہے کی گنجائش باقی نہ رہے۔ ایسی مدلل، مبرہن اور منضبط کتاب کو شعر و شاعری سے کیا تعلق! دنیا کی پوری تاریخ میں کس شاعر نے اس طرح کی کتاب پیش کی ہے!

لِّیُنْذِرَ مَنْ کَانَ حَیًّا وَّیَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ (۷۰)

قرآن کے اتارے جانے کا مقصد

'یُنْذِرَ' کا فاعل نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ اس قرآن مبین کے اتارے جانے کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر یہ قرآن اس لیے اتارا ہے کہ اس کے ذریعے سے وہ ان لوگوں کو انذار کرے جن کے اندر حیاتِ عقلی و روحانی کی رمق باقی ہے۔ رہے وہ لوگ جن کے دل مردہ ہو چکے ہیں وہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھائیں گے البتہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر حجت پوری ہو جائے گی اور وہ خدا کے ہاں یہ عذر نہیں کر سکیں گے کہ ان کے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا ورنہ وہ ہدایت اختیار کرنے والے بنتے۔

فعل 'انذار' یہاں اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے اور 'حَیّ' سے دل کے زندہ مراد ہیں۔ ایک مُنذر انذار کرتا تو سب کو ہے لیکن اس کا انذار کارگر صرف انہی لوگوں پر ہوتا ہے جن کی فطرت زندہ ہوتی ہے۔ اس لیے کہ بات پر دھیان وہی کرتے ہیں، جیسا کہ فرمایا ہے۔ 'اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّکْرَ' (یٰسٓ: ۱۱) (تم انہی کو ڈرا سکتے ہو جو نصیحت پر دھیان کریں)۔ چونکہ حقیقت کے اعتبار سے زندہ وہی لوگ ہوتے ہیں اس وجہ سے قرآن نے انہی کو زندہ کہا ہے۔ جو اس وصف سے محروم ہیں وہ زندہ نہیں بلکہ مردہ ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کی نسبت فرمایا ہے 'وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ' (فاطر: ۲۲) اس اسلوبِ بیان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ تسلی بھی ہے کہ تمہارا کام زندوں کو جگانا ہے، مردوں کو جگانا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ مضمون مختلف اسلوبوں سے قرآن میں بار بار بیان ہوا ہے۔

'اَلْقَوْلُ' سے مراد وہ قول ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے چیلنج کے جواب میں فرمایا تھا کہ میں بنی آدم

کی ہدایت کے لیے اپنی کتاب اور اپنی ہدایت نازل کروں گا۔ پھر جو اس کے بعد بھی تیری پیروی کریں گے تو میں ان سب کو تیرے سمیت جہنم میں بھر دوں گا۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ۝ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ۝ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ۭ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ (۷۱-۷۳)

قرآن کی دعوت کی تائید میں آیاتِ ربوبیت کا حوالہ

ان آیات کا موقع و محل سمجھنے کے لیے اس سورہ کی آیات ۳۳-۳۵ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ جس طرح وہاں قرآن کے انذار اور اس کی دعوت توحید کا حوالہ دینے کے بعد بعض آیاتِ ربوبیت کی طرف توجہ دلائی ہے اور پھر خدا ہی کی شکرگزاری کا مطالبہ کیا ہے اسی طرح یہاں بھی قرآن کی دعوت کی تائید میں اپنی ربوبیت کی بعض نشانیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد خدا ہی کی شکرگزاری کا مطالبہ کیا ہے۔ گویا تمہید کا مضمون خاتمہ میں ایک نئے اسلوب سے پھر سامنے آگیا۔

'اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ الاٰیۃ' فرمایا کہ کیا وہ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ ہم نے اپنی قدرت و حکمت سے چوپائے بنائے اور پھر ان کو ان کا مالک بنا دیا۔ وہ ان پر پوری آزادی سے مالکانہ تصرف کرتے اور اپنی تمام ضروریات میں ان کو استعمال کرتے ہیں۔ 'مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ' میں وہی بات ایک دوسرے اسلوب سے فرمائی گئی ہے جو پیچھے آیت ۳۵ میں 'وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ' کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں خود اپنے وجود سے شاہد ہیں کہ صرف خدا ہی کی قدرت و حکمت نے ان کو وجود بخشا ہے، کسی دوسرے کی مجال نہیں تھی کہ ان کو وجود میں لا سکتا یا ان کو انسان کا مطیع و فرمانبردار بنا سکتا۔ یہ محض ربِّ کریم کی کریمی ہے کہ اس نے ان کو اپنی قدرت و حکمت سے بنایا اور پھر ان کو انسان کی غلامی میں دے دیا ـــــ مطلب یہ ہے کہ یہ صورتِ حال دعوت دیتی ہے کہ انسان غور کرے کہ قدرت کے اس بے پایاں انعام کے عوض میں اس پر کوئی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے یا نہیں؟ قرآن اس سوال کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا اور اس کے نتائج سے آگاہ کرنا چاہتا ہے لیکن احمق لوگ حقیقت کی اس یاد دہانی کو شاعری سمجھتے ہیں۔

'وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ الاٰیۃ' یعنی یہ محض خدا کی ربوبیت و رحمت ہے کہ اس نے ان چوپایوں کو انسان کی معاشی ضروریات کے لیے سازگار بنایا اور پھر ان کو اس طرح انسان کا مطیع بنا دیا ہے کہ وہ جس طرح چاہے ان کو استعمال کرتا ہے۔ اگر خدا نہ چاہتا تو یہ چوپائے نہ تو انسان کی ضروریات کے لیے سازگار ہوتے اور نہ وہ ان کو اپنا مطیع بنا سکتا۔ آخر دنیا میں کتنے جانور ایسے ہیں جو نہ تو انسان کی ضروریات کے لیے کارآمد ہیں اور نہ وہ ان کو چوپایوں کی طرح اپنا غلام ہی بنا سکتا ہے۔ اگر وہ ان کو مسخر بھی کرلے جب بھی وہ ایک بوجھ تو اس کے لیے بن سکتے ہیں لیکن اس کا کوئی بوجھ اٹھانے والے نہیں بن سکتے۔ فرمایا کہ ان چوپایوں ہی میں سے بعض وہ ہیں جن سے وہ سواری کا کام لیتا ہے اور بعض وہ ہیں جن سے وہ اپنی غذائی ضروریات پوری کرتا ہے۔

وَلَهُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ۔ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ۔ یعنی سواری اور غذا کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد ان سے حاصل ہوتے ہیں۔ ان کی کھال، ان کے بال، ان کی ہڈی، ان کے اون وبر، غرض ان کی چیز چیز جو انسان کے لیے نافع نہیں ہے۔ اسی طرح ان کے دودھ اور اس دودھ سے بنی ہوئی پینے کی مختلف چیزیں — دہی، لسی، چھاچھ — سب انسان کے لیے لذیذ، خوش گوار اور صحت بخش ہیں۔ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ۔ تو کیا یہ نعمتیں ان کے اوپر کوئی حق نہیں عائد کرتیں اور ان سے یہ مطالبہ نہیں کرتیں کہ جس رب کی بخشی ہوئی نعمتوں سے وہ فائدہ اٹھا رہے ہیں اس کے شکرگزار و فرمانبردار بھی بنیں! یہ نعمتیں زبانِ حال سے انسان کو یہ سبق پڑھا رہی ہیں اور اسی سبق کی یاددہانی اللہ کی کتاب بھی کر رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی واضح حقیقت کو سمجھنے اور ماننے کے بجائے اس کو شاعری قرار دے کر اس سے گریز کی راہیں کیوں سوچ رہے ہو!

وَاتَّخَذُوا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ (۷۴-۷۵)

حقیقت سے فرار کے لیے چور دروازے

یعنی اس واضح حقیقت کا مواجہہ کرنے کے بجائے انھوں نے حقیقت سے فرار کے لیے چور دروازے پیدا کیے ہیں۔ حق تو یہ تھا کہ جس رب کی نعمتوں سے بہرہ مند ہو رہے ہیں اس کے حقوق و فرائض پہچانتے اور ان کو ادا کرتے لیکن انھوں نے کیا یہ ہے کہ خدا کے سوا کچھ دوسرے معبود انھوں نے ایجاد کیے ہیں اور ان کے کچھ رسوم ادا کر کے یہ توقع کر رہے ہیں کہ اگر خدا کی طرف سے کوئی گرفت ہوئی تو ان کی مدد سے وہ چھوٹ جائیں گے۔

لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ الاٰیۃ۔ فرمایا کہ ان کی مدد تو وہ کیا خاک کر سکیں گے۔ البتہ یہ ہو گا کہ ان کے ساتھ یہ بھی ان کی فوج کی حیثیت سے خدا کے حضور میں حاضر کیے جائیں گے اور پھر اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا کہ یہ کس سزا کے مستحق ہیں۔

فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ (۷۶)

آنحضرت صلعم کو تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ جو کچھ بھی کہیں اس کو برداشت کرو، اس کا غم نہ کرو۔ یہ تمھیں شاعر، خبطی اور مفتری جو کچھ بھی کہتے ہیں کہنے دو اور یہ اطمینان رکھو کہ اللہ ان کی خفیہ سازشوں اور ترازوں سے بھی اچھی طرح واقف ہے اور جو کچھ یہ علانیہ کہہ اور کر رہے ہیں اس کو بھی جانتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب خدا سب کچھ جانتا ہے تو تم کیوں غم کرو! تم خدا کا کام کر رہے ہو، کرتے رہو اور یہ بھروسہ رکھو کہ تمھارے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے تمھارا رب کافی ہے۔

اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۭ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ (۷۷-۷۸)

'انسان' سے مراد قریش ہی ہیں جن سے یہاں بحث ہے۔ بے التفاتی کے اظہار کے لیے لفظ عام استعمال فرمایا ہے۔

'ضَرَبَ مَثَلًا' کوئی تمثال بیان کرنے یا حکمت کی بات کہنے کے لیے بھی آتا ہے اور موقع ہو تو کسی پر طنز یا پھبتی چست کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یہاں یہ اس دوسرے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

یہ کلام اپنے ماسبق سے دو پہلوؤں سے ربط رکھتا ہے۔ اوپر کی آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تسلی دی گئی ہے اس سے بھی اس کا تعلق ہے اور اُس سے اوپر کی آیات میں قریش کو خدا کی ربوبیت کے جو مقتضیات بتائے گئے ہیں اس سے بھی اس کا ربط ہے۔

تسلی کے مضمون سے اس کا ربط یوں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا ہے کہ جو سرپھرے لوگ خدا پر بھی پھبتی چست کر رہے ہیں اور اپنی پیدائش کو بھول کر بڑے طنطنہ سے یہ سوال کر رہے ہیں کہ بوسیدہ ہڈیوں میں کون زندگی پیدا کر سکتا ہے وہ اگر پیغمبر پر طنز کریں اور اس کو شاعر و مجنون قرار دیں تو ان سے کیا بعید ہے۔

ربوبیت کے مضمون سے اس کا تعلق یوں ہے کہ ربوبیت جس طرح شکر اور توحید کو مقتضی ہے اسی طرح ایک روزِ حساب و کتاب کو بھی مقتضی ہے (اس مضمون کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے) لیکن انسان کی بلادت کا یہ حال ہے کہ وہ خدا کی نعمتوں سے متمتع ہونے کے باوجود یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ کوئی روزِ حساب و کتاب بھی آنے والا ہے جس دن اس سے ان نعمتوں کی بابت پرسش ہونی ہے اور اگر اس کو اس کی یاددہانی کی جاتی ہے تو وہ ایک حریف بن کر سامنے آتا ہے اور اپنی پہلی خلقت کو بالکل بھول کر طنزیہ انداز میں سوال کرتا ہے کہ بھلا بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کر سکتا ہے! فرمایا کہ ان کو بتا دو کہ ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی بار پیدا کیا۔ اگر پہلی بار ان کو پیدا کرنے میں اس کو کوئی زحمت نہیں پیش آئی تو دوبارہ اس کو پیدا کرنے میں کیوں زحمت پیش آئے گی!

'وَنَسِيَ خَلْقَهُ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ احمقانہ سوال وہی کر سکتا ہے جس کو اپنی پہلی خلقت یاد نہ رہی ہو۔ جس کو اپنی پہلی خلقت یاد ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو اسی مٹی سے وجود میں لایا ہے تو وہ یہ سوال نہیں کر سکتا اگر کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کا حریف بن کر اس سے لڑنے اٹھا ہے۔

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ (۹)

'وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ'۔ 'خلق' یہاں مخلوق کے معنی میں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوقات کو جانتا ہے۔ 'أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ' (کیا وہ نہیں جانتے گا جس نے پیدا کیا)۔ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ مٹی میں رل مل جانے کے بعد وہ ان کو بھول جائے گا۔ وہ ان کے وجود کے ایک ایک ذرے سے باخبر ہے۔ 'قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنقُصُ الْأَرْضُ مِنْهُمْ ۖ وَعِندَنَا كِتَابٌ حَفِيظٌ' (ق — ۴) (زمین ان کے اندر سے جو کچھ کم کرتی ہے ہم اس کو جانتے رہے ہیں اور ہمارے پاس سارا ریکارڈ رکھنے والی ایک کتاب ہے)۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْہُ تُوْقِدُوْنَ (۸۰)

ضد سے ضد کا ظہور

یعنی اس بات کو مستبعد نہ خیال کرو کہ راکھ اور مٹی سے زندگی نمودار ہو جائے گی۔ ضد سے ضد کے نمودار ہونے کا کرشمہ تم برابر اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو۔ تم ہر سبز درخت کی دو شاخیں لیتے اور ان کو ایک دوسرے سے رگڑ کر ان سے آگ جلا لیتے ہو۔ جس خدا نے اپنی قدرت کی یہ شان دکھائی ہے اس کے لیے یہ کیا بعید ہے کہ وہ مٹی اور راکھ کے اندر سے زندگی نمودار کر دے! 'الشجر الاخضر' سے مراد وہ درخت ہیں جو عرب کے بعض علاقوں میں پائے جاتے ہیں اور صحراؤں کے مسافر ان کی شاخوں سے چقماق کا کام لیتے رہے ہیں۔

سلف میں سے بعض لوگوں نے اس آیت کی تاویل اس سے مختلف بھی کی ہے لیکن مجھے اس میں تکلف محسوس ہوتا ہے۔ یہ تاویل بالکل واضح ہے۔ عرب میں بعض درخت پائے جاتے تھے جن سے لوگ چقماق کا کام لیتے تھے۔ کتابوں میں ان کے نام بھی مذکور ہوئے ہیں۔ اگر اب یہ درخت نہ پائے جاتے ہوں یا بہت نایاب ہوں تو اس سے کچھ فرق نہیں پیدا ہوتا۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے برابر محو و اثبات ہوتا رہتا ہے۔ اگر قرآن کے مخاطبِ اول اس سے واقف تھے تو یہ استدلال بالکل برمحل ہے۔ اس کی اصل بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ ضد سے ضد کے وجود کے شواہد اس دنیا میں موجود ہیں اور یہ ایک ایسی بات ہے جس سے انکار کی گنجائش کسی کے لیے بھی نہیں ہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ سب سے زیادہ زوردار آگ پانی کے اندر پائی جاتی ہے!

اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَھُمْ ط بَلٰی ق وَھُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ (۸۱)

سوال کا جواب ایک دوسرے پہلو سے

اسی استبعاد کو ایک دوسرے پہلو سے رفع فرمایا ہے کہ جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کر دیا اور اس کو اس میں کوئی مشکل نہیں پیش آئی کیا وہ ان کی جیسی مخلوق کو دوبارہ پیدا کر دینے پر قادر نہیں ہو سکتا؟ یہ سوچیں کہ ان دونوں میں زیادہ مشکل کام کون سا ہے؟ 'بَلٰی ق وَھُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ' یہ اس سوال کا خود ہی جواب دیا ہے کہ ہاں، وہ پوری طرح قادر ہے کہ ان کو دوبارہ پیدا کر دے۔ اس جواب سے مخاطب کے لیے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی اگرچہ وہ کتنی ہی سخن سازیاں کرے۔ 'وَھُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ' یہ اللہ تعالیٰ کی صفات سے مذکورہ دعوے پر دلیل ہے کہ اصل پیدا کرنے والا اور علم رکھنے والا تو خدا ہی ہے۔ اوپر آیت ۹۷ میں فرمایا ہے 'وَھُوَ بِکُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمٌ' اسی مضمون کو یہاں زیادہ زوردار الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ خدا بڑا پیدا کرنے والا ہے، کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اس دنیا کو پیدا کر کے وہ تھک گیا یا اس کی قوتِ تخلیق ختم ہو گئی بلکہ وہ اسی طرح تازہ دم ہے جس طرح پہلے تھا اور وہ اپنی ہر مخلوق کے اجزائے ترکیبی سے اچھی طرح باخبر ہے، وہ جب چاہے گا ازسرِ نو اس کے پور پور اور جوڑ جوڑ کو ٹھیک کرے گا۔

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (۸۲)

یعنی کوئی اس غلط فہمی میں بھی نہ رہے کہ کسی چیز کو پیدا کرنے کے لیے خدا کو کارخانے قائم کرنے پڑتے ہیں یا سرمایہ، میٹیریل، لیبر اور مشینوں کا اہتمام و انتظام کرنا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے کسی ارادے کی تکمیل میں کسی چیز کا بھی محتاج نہیں ہے۔ اس کا معاملہ بس یوں ہے کہ جب وہ کسی بات کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کو حکم فرماتا ہے کہ وہ ہو جائے اور وہ اس کے حکم کے مطابق ہو جاتی ہے۔

فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۸۳)

'ملکوت' کے معنی اختیار و اقتدار کے ہیں۔ یہ آخر میں تنبیہ فرمائی کہ جس خدا کے ہاتھ میں ہر چیز کی زمام ہے اور جس کی طرف ہی تمہیں لوٹ کر جانا ہے وہ ہر نقص و عیب سے منزہ ہے تو اس کو ہر عیب سے منزہ مانو اور اس کی پاکی بیان کرتے رہو۔ اس کی ذات و صفات اور اس کے حقوق میں کوئی شریک نہیں، وہ ہر شرکت سے ارفع ہے، اس نے یہ دنیا عبث نہیں بنائی ہے اس وجہ سے ہر ایک کو خدا کے حضور حاضر ہونا اور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔ اس کے لیے لوگوں کو مرنے اور سڑ گل جانے کے بعد دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا ذرا مشکل نہیں، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے، کوئی چیز بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں اور کسی کا کوئی قول و عمل بھی اس سے مخفی نہیں۔

اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی رہنمائی سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ الحمد للہ علیٰ ذٰلک

رحمان آباد
۸؍ مارچ ۱۹۷۵ء